ماہنامہ

# اشراق

لاہور

جلد ۲۱ شمارہ ۲ فروری ۲۰۰۹ صفر ۱۴۳۰

## فہرست

جاوید احمد غامدی

# سر کی اوڑھنی

اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے کہ مسلمان عورتیں اپنے ہاتھ، پاؤں اور چہرے کے سوا جسم کے کسی حصے کی زیبایش، زیورات وغیرہ اجنبی مردوں کے سامنے نہیں کھولیں گی۔ قرآن نے اِسے لازم ٹھیرایا ہے۔ سر پر دوپٹا یا اسکارف اوڑھ کر باہر نکلنے کی روایت اِسی سے قائم ہوئی ہے اور اب اسلامی تہذیب کا حصہ بن چکی ہے۔ عورتوں نے زیورات نہ پہنے ہوں اور بناؤ سنگھار نہ بھی کیا ہو تو وہ اِس کا اہتمام کرتی رہی ہیں۔ یہ رویہ بھی قرآن ہی کے اشارات سے پیدا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ دوپٹے سے سینہ اور گریبان ڈھانپ کر رکھنے کا حکم اُن بوڑھیوں کے لیے نہیں ہے جو نکاح کی امید نہیں رکھتی ہیں، بشرطیکہ وہ زینت کی نمایش کرنے والی نہ ہوں۔ قرآن کا ارشاد ہے وہ اپنا یہ کپڑا مردوں کے سامنے اتار سکتی ہیں، اِس میں کوئی حرج نہیں ہے، مگر ساتھ ہی وضاحت کر دی ہے کہ پسندیدہ بات اُن کے لیے بھی یہی ہے کہ احتیاط کریں اور دوپٹا سینے سے نہ اتاریں۔ اِس سے واضح ہے کہ سر کے معاملے میں بھی پسندیدہ بات یہی ہونی چاہیے اور بناؤ سنگھار نہ بھی کیا ہو تو عورتوں کو دوپٹا سر پر اوڑھ کر رکھنا چاہیے۔ یہ اگرچہ واجب نہیں ہے، لیکن مسلمان عورتیں جب مذہبی احساس کے ساتھ جیتی اور خدا سے زیادہ قریب ہوتی ہیں تو وہ یہ احتیاط لازماً ملحوظ رکھتی ہیں اور کبھی پسند نہیں کرتیں کہ کھلے سر اور کھلے بالوں کے ساتھ اجنبی مردوں کے سامنے ہوں۔

# نیل پالش

عورتیں اپنے ناخن کسی نہ کسی چیز سے رنگتی رہی ہیں۔ ہمارے زمانے میں اِس کے لیے مختلف اقسام کی نیل پالش ایجاد ہو گئی ہیں۔ مہندی وغیرہ کے برعکس اِس کی موٹی تہ چونکہ ناخن پر جمالی جاتی ہے، اِس لیے یہ سوال پیدا ہوا کہ اِس

کے ساتھ وضو کا کیا کیا جائے؟ اِس کے تین جواب دیے گئے ہیں:

ایک یہ کہ نیل پالش پر وضو نہیں ہوتا، اِس لیے ہر وضو سے پہلے اِسے لازماً اتارنا چاہیے۔

دوسرا یہ کہ نیل پالش لگانے کے بعد بھی ہاتھ ہاتھ ہی ہوتا ہے، اِس لیے وضو ہو جائے گا۔ اِسے اتارنے کی ضرورت نہیں ہے۔

تیسرا یہ کہ اِسے جرابوں کے مسح پر قیاس کرنا چاہیے۔ چنانچہ نیل پالش اگر وضو کر کے لگائی گئی ہے تو اتارنے کی ضرورت نہیں ہے، اِس کے اوپر ہی وضو کر لیا جائے گا، لیکن وضو کے بغیر لگائی گئی ہے تو اِسے اتار کر وضو کرنا چاہیے۔

ہمارے نزدیک یہی تیسرا مسلک قابل ترجیح ہے۔ یہ احتیاط کا مسلک ہے، اِس میں کوئی مشقت بھی نہیں ہے اور تزکیہ وتطہیر کے مقصد سے بھی یہ زیادہ قریب ہے۔ اِس لیے بہتر یہی ہے کہ عورتیں اپنے پروردگار کے حضور میں حاضری کے لیے اِس کا اہتمام کر لیں۔

# عورتوں کا سفر

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے عورتوں کو محرم کے بغیر سفر کرنے سے روکا اور فرمایا ہے کہ اِس طرح کا سفر اُن کے لیے جائز نہیں ہے۔ اِس کی مدت بعض روایتوں میں ایک، بعض میں دو اور بعض میں تین شب و روز بیان ہوئی ہے۔* یہ سد ذریعہ کی ہدایت ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جس چیز سے روکا گیا ہے، وہ اصلاً ممنوع نہیں ہے، لیکن ممنوعات میں سے کسی چیز تک پہنچنے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ اِس کے مخاطبین بھی افراد بحیثیت افراد ہیں۔ اِس میں ریاست سے یہ تقاضا نہیں کیا گیا کہ وہ کسی عورت کو محرم کے بغیر سفر کی اجازت نہیں دے گی۔ پھر یہ بات بھی واضح ہے کہ اِس طرح کی ہدایات ہمیشہ حالات سے متعلق ہوتی ہیں۔ اسلام میں عورت کی عفت و عصمت کو جو اہمیت حاصل ہے، اُس کے پیش نظر ضروری تھا کہ زمانۂ رسالت کے حالات میں اُنھیں محرم کے بغیر سفر کرنے سے روکا جائے۔ اُس زمانے میں سفر پیدل یا اونٹ گھوڑوں پر کیا جاتا تھا۔ جن مقامات تک اب ہم گھنٹوں میں پہنچ جاتے ہیں، اُس وقت وہاں پہنچنے میں ہفتے، بلکہ مہینے لگ جاتے تھے۔ مسافر تنہا یا قافلوں میں سفر کرتے اور بعض اوقات جنگلوں اور بیابانوں سے گزر کر اپنی منزل تک پہنچتے تھے۔ رات آ جاتی تو کھلے آسمان تلے قافلوں میں یا اجنبی شہروں کی

سرایوں میں قیام کرنا پڑتا تھا۔ اِس طرح کے حالات میں اگر عورتوں کی حفاظت کے پیش نظر اور اُنھیں کسی تہمت سے بچانے کے لیے پابند کیا گیا کہ وہ محرم کے بغیر سفر نہ کریں تو اِس کی حکمت ہر سلیم الطبع آدمی آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے۔

دورِ حاضر نے اِس کے برخلاف سفر کے ذرائع میں حیرت انگیز انقلاب برپا کر دیا ہے۔ مہینوں کا سفر اب گھنٹوں میں ہوتا ہے۔ ریل، جہاز اور بسوں میں حفاظت کے غیر معمولی انتظامات ہیں۔ ہوٹلوں اور سرایوں وغیرہ کا نظم بھی بالکل تبدیل ہو چکا ہے۔ آج سے سو سال پہلے اپنی بہن یا بیٹی کو تنہا ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک بھیجنے میں بھی تردد ہوتا تھا، لیکن اب یورپ اور امریکا کے سفر میں بھی اِس طرح کا کوئی تردد محسوس نہیں ہوتا۔ حج کا سفر بھی آخری درجے میں محفوظ ہو چکا ہے اور عورتیں اپنی شناسا عورتوں کی معیت میں نہایت اطمینان کے ساتھ حجاز مقدس جا سکتی اور حج وعمرہ کے مناسک ادا کر سکتی ہیں۔ حالات کی یہ تبدیلی تقاضا کرتی ہے کہ حکم کو دورِ حاضر کے سفروں سے متعلق نہ سمجھا جائے اور عورتوں کو اجازت دی جائے کہ خطرے کی کوئی جگہ نہ ہو تو اپنی ضرورتوں کے لحاظ سے وہ تنہا یا عورتوں کی معیت میں جس طرح چاہیں، سفر کریں، تاہم اتنی بات ملحوظ رکھیں کہ اُن کی عزت ہر حال میں محفوظ رہے اور گھروں سے نکلتے وقت اُن سے کوئی غفلت نہ ہو۔ وہ اگر اللہ اور اُس کے رسول کو ماننے والی ہیں تو اِس معاملے میں اُنھیں بے پروا نہیں ہونا چاہیے۔

---

* بخاری، رقم ۱۰۸۶۔ مسلم، رقم ۳۲۷۰۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# سورة المائدہ

(۹)

(گذشتہ سے پیوستہ)

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ، اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ، قَالَ: لَاَقْتُلَنَّكَ. قَالَ: اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۷﴾ لَئِنْ

(تمھاری مخالفت میں اب یہ آمادۂ فساد ہیں، اے پیغمبر)، اِنھیں آدم کے دو بیٹوں کا قصہ سناؤ[۷۳]، جس طرح کہ وہ فی الواقع ہوا[۷۴]، جب اُن دونوں نے قربانی پیش کی تو اُن میں سے ایک کی قربانی قبول کر لی گئی اور دوسرے کی قبول نہیں کی گئی[۷۵]۔ (پھر جس کی قربانی قبول نہیں کی گئی)، اُس نے کہا: میں تجھے قتل کر دوں گا[۷۶]۔ دوسرے نے جواب دیا: اللہ تو اپنے اُنھی بندوں کی قربانی قبول کرتا ہے جو اُس سے ڈرنے

[۷۳] اصل میں لفظ 'نَبَاَ' آیا ہے۔ عربی زبان میں یہ کسی اہم واقعے یا حادثے کی خبر کے لیے آتا ہے۔ خدا کی زمین پر ایک حق پرست کے خون ناحق کا یہ پہلا واقعہ ہے، اس لیے قرآن نے اِس کو اِس لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

[۷۴] یعنی بے کم وکاست اور ٹھیک اُن حقائق کے مطابق جو اُس سے متعلق ہیں۔

[۷۵] اصل میں لفظ 'قربان' استعمال ہوا ہے۔ یہ صدقہ اور قربانی، دونوں کے لیے آتا ہے۔ اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے جو چیز بھی اُس کے حضور میں پیش کی جائے، وہ قربان ہے۔ یہاں قرآن نے یہ وضاحت نہیں کی کہ ہابیل اور قابیل کو قربانی کی قبولیت یا عدم قبولیت کا پتا کس طرح چلا۔ اِس کی ایک صورت قرآن مجید نے سورۂ آل عمران

بَسَطْتَّ اِلَیَّ یَدَكَ لِتَقْتُلَنِیْ، مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیْكَ لِاَقْتُلَكَ، اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۲۸﴾ اِنِّیْٓ اُرِیْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِیْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ

والے ہوں[۷۶]۔تم مجھے قتل کرنے کے لیے مجھ پر ہاتھ اٹھاؤ گے تو (تم سے پہل کر کے) میں تمھارے قتل کے لیےتم پر ہاتھ اٹھانے والا نہیں ہوں، میں اللہ رب العٰلمین سے ڈرتا ہوں[۷۸]۔میں چاہتا ہوں کہ (تم

(۳) کی آیت ۱۸۳ میں یہ بیان فرمائی ہے کہ آسمان سے ایک آگ اترتی اور قبولیت کی علامت کے طور پر قربانی کو کھا لیتی تھی۔ بائیبل کا بیان، البتہ مختلف ہے، اُس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اِس کی خبر اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی تھی:

”...اور خداوند نے ہابل کو اور اُس کے ہدیے کو منظور کیا، پر قائن کو اور اُس کے ہدیے کو منظور نہ کیا، اِس لیے قائن نہایت غضب ناک ہوا اور اُس کا منہ بگڑا۔ اور خداوند نے قائن سے کہا: تو کیوں غضب ناک ہوا، اور تیرا منہ کیوں بگڑا ہوا ہے؟ اگر تو بھلا کرے تو کیا تو مقبول نہ ہو گا؟ اور اگر تو بھلا نہ کرے تو گناہ دروازے پر دبکا بیٹھا ہے اور تیرا مشتاق ہے۔ پر تو اُس پر غالب آ۔“ (پیدایش ۴: ۴-۷)

[۷۶] یعنی بجاے اِس کے کہ وہ اپنی نیت کے کھوٹ کی طرف متوجہ ہوتا اور توبہ و اصلاح کے جذبے سے اپنے پروردگار کی طرف لوٹتا، اُس پر حسد کا دورہ پڑا اور اِس غصے میں کہ اُس کی قربانی قبول نہیں ہوئی، ہابیل کے درپے انتقام ہو گیا، دراں حالیکہ اُس کے قبول نہ ہونے میں ہابیل کا کوئی دخل نہیں تھا۔ یہ بعینہٖ وہی ذہنیت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں یہود کی طرف سے ظاہر ہوئی۔ اپنے جرائم کی طرف متوجہ ہونے اور یہ سمجھنے کی کوشش کرنے کے بجاے کہ نبوت کا منصب اُن سے لے کر بنی اسمٰعیل کو کیوں دیا گیا ہے، وہ اپنے اِن بھائیوں کے درپے آزار ہو گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے قتل کے منصوبے بنانے لگے۔ قرآن نے یہ سرگزشت اِسی بنا پر اُن کو سنانے کے لیے کہا ہے۔

[۷۷] ہابیل نے یہ بات اپنے بھائی کو اصل حقیقت کی طرف توجہ دلانے کے لیے کہی ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”...مطلب یہ ہے کہ تم اِس غصے میں کہ تمھاری قربانی قبول نہیں ہوئی، میرے قتل کے درپے ہو گئے ہو، حالاں کہ اِس میں نہ قصور میرا ہے نہ خداوند کا ہے، بلکہ سراسر قصور تمھارا اور تمھاری قربانی کا ہے۔ خداوند کے ہاں قربانی درخور قبول وہ ٹھیرتی ہے جو خدا سے ڈرنے والے بندے قربانی کے آداب و شرائط کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ یہ ضابطہ جس طرح تمھارے لیے ہے، اِسی طرح میرے لیے بھی ہے تو قربانی رد ہونے کا غم و غصہ ہے تو فکر تقویٰ کی کرو، نہ کہ

النَّارِ، وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۲۹﴾

فَطَوَّعَتۡ لَهٗ نَفۡسُهٗ قَتۡلَ اَخِيۡهِ، فَقَتَلَهٗ فَاَصۡبَحَ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۳۰﴾ فَبَعَثَ

نے میرے قتل کا ارادہ کرلیا ہے تو) اپنے اور میرے گناہ کا بار تمھی لے جاؤ[79] اور دوزخی بن کر رہو۔ اِس طرح کے ظالموں کی یہی سزا ہے۔ ۲۷-۲۹

(اِس پر بھی وہ باز نہیں آیا اور) اُس کے نفس نے بالآخر اپنے بھائی کے قتل پر اُس کو آمادہ کرلیا[80] اور

میرے قتل کرنے کی۔ میرے قتل کرنے سے تمھاری قربانی کی قبولیت کی راہ کس طرح کھلے گی۔''

(تدبرقرآن ۲/۴۹۷)

[۷۸] یعنی میں یہ جان لینے کے باوجود کہ تم میرے قتل کے درپے ہو، تمھارے قتل کے لیے پہل نہیں کروں گا، اِس لیے کہ میں اُس خدا سے ڈرتا ہوں جو کائنات کا پروردگار ہے اور جس نے انسان کے جان و مال اور آبرو کو حرمت عطا فرمائی ہے۔

[۷۹] اصل میں 'اَنۡ تَبُوۡٓاَ بِاِثۡمِيۡ وَ اِثۡمِكَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ عربیت کی رو سے دونوں میں مضاف محذوف ہے۔ ہم نے ترجمے میں اِسے کھول دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی جان بچانے کی کوشش کرتے ہوئے اگر کوئی نقصان تمھیں پہنچ جائے تو اِس کا گناہ بھی تمھارے سر ہی ہوگا، اِس لیے کہ اِس کا سبب میں نہیں، بلکہ تمھی ہو گے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...یہ اُس اصول عدل کی طرف اشارہ ہے جو ایک حدیث میں 'فعلی البادی مالم یعتد المظلوم'* کے الفاظ سے بیان ہوا ہے۔ یعنی اگر مظلوم نے کوئی زیادتی نہیں کی ہے تو جو کچھ اُسے اپنی عزت کی حفاظت کے لیے کرنا پڑے، اُس کا بار گناہ پہل کرنے والے پر ہے۔ 'باثمی' کے ساتھ 'باثمك' مماثلت کے اُس اصول پر فرمایا ہے جو عربی زبان میں نہایت معروف ہے۔ مثلاً 'دناهم كما دانوا' یا 'جزاء سيئة سيئة مثلها'۔''

(تدبرقرآن ۲/۴۹۸)

[۸۰] اِس جملے سے قرآن نے اُس اندرونی کشمکش کو نمایاں کر دیا ہے جو اول اول اِس ارادۂ قتل سے قابیل کے اندر پیدا ہوئی۔

[۸۱] یعنی خیر و شر کی اِس کشمکش میں شر فتح مند رہا اور وہ خود اُس سے مغلوب ہو کر ہمیشہ کے لیے نامراد ہو گیا۔

* مسلم، رقم ۶۶۸۳۔

اللّٰہُ غُرَابًا یَّبْحَثُ فِی الْاَرْضِ لِیُرِیَہٗ کَیْفَ یُوَارِیْ سَوْءَ ۃَ اَخِیْہِ، قَالَ: یٰوَیْلَتٰٓی
اَعَجَزْتُ اَنْ اَکُوْنَ مِثْلَ ھٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِیَ سَوْءَ ۃَ اَخِیْ، فَاَصْبَحَ مِنَ
النّٰدِمِیْنَ ﴿۳۱﴾

اُسے مار کر وہ اُن لوگوں میں شامل ہو گیا جو نقصان اٹھانے والے ہیں[۸۱]۔ پھر اللہ نے ایک کوے کو بھیجا جو زمین کھودنے لگا تاکہ اُس کو بتائے کہ وہ اپنے بھائی کی لاش کس طرح چھپائے[۸۲]۔ یہ دیکھ کر وہ بولا: ہائے میری کم بختی، میں اِس کوے جیسا بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش ہی چھپا لیتا۔ سو (اِس پر) وہ بے حد شرمندہ ہوا[۸۳]۔ ۳۰-۳۱

[۸۲] اللہ تعالیٰ کی طرف کوا بھیجنے کی یہ نسبت درحقیقت اُس سنت الٰہی کی نسبت ہے جس کے تحت خدا کی یاد سے غافل ہو جانے والے اِسی طرح شیطان کے حوالے کر دیے جاتے اور کووں سے الہام پاتے ہیں۔

[۸۳] ہابیل و قابیل کی اِس سرگزشت سے واضح ہے کہ دین و اخلاق کے بنیادی تصورات تک انسان کسی ارتقا کے ذریعے سے نہیں پہنچا، بلکہ یہ ابتدا ہی سے اُس کو تعلیم کر دیے گئے تھے۔

[باقی]

ساجد حمید

# شکار کا ایک دو دن بعد ملنا

قَالَ[1] عَدِیُّ بْنُ حَاتِمٍ سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: إِنَّ أَرْضَنَا أَرْضُ صَیْدٍ فَیَرْمِیْ أَحَدُنَا الصَّیْدَ فَیَغِیْبُ عَنْہُ لَیْلَةً أَوْ لَیْلَتَیْنِ فَیَجِدُہُ وَفِیْہِ سَھْمُہُ.

قَالَ [إِنَّ ھُوَامُّ اللَّیْلِ کَثِیْرَةً[2]]. إِذَا وَجَدْتَّ سَھْمَکَ وَلَمْ تَجِدْ فِیْہِ أَثَرَ غَیْرِہِ [وَلَمْ یَأْکُلْ مِنْہُ سَبُعٌ[3]] وَعَلِمْتَ اَنَّ سَھْمَکَ قَتَلَہُ فَکُلْہُ [مَا لَمْ یُنْتِنْ[4]].

---

عدی بن حاتم کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ہمارا علاقہ شکاریوں کا ہے۔تو ہم میں سے کوئی شکار کے لیے تیر چلاتا ہے تو وہ شکار ایک یا دو دن تک ملتا ہی نہیں، پھر اگر وہ اپنا شکار پا لے اور اس میں اپنا تیر دیکھے (تو کیا اسے کھا لے)؟

آپ نے فرمایا: رات کو آوارہ (جانور) بہت ہوتے ہیں،اس لیے تم اگر اس میں اپنا تیر پاؤ اور شکار کے جسم پر کسی اور چیز کا نشان نہ پاؤ اور یہ کہ اس میں سے کسی درندے نے نہ کھایا ہو اور تمھیں یقین ہو کہ یہ جانور تمھارا تیر لگنے ہی سے مرا ہے تو اسے کھا لو[1]، جبکہ وہ گلنے سڑنے سے بد بودار نہ ہو گیا ہو[2]۔

# ترجمے کے حواشی

۱۔ پچھلی روایت میں شکار سے متعلق اصولی مباحث سارے ہی بیان ہو گئے تھے۔ اس حدیث میں عدی بن حاتم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے ایک عملی مسئلے کے بارے میں استفسار کیا کہ شکار کھانے کی اجازت کا حکم کیا اس شکار کے لیے بھی ہوگا جس کو ہمارا تیر لگے اور وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو جائے، ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک یا دو دن گزر جائیں اور وہ مردہ حالت میں ملے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا: ہاں وہ شکار جائز ہوگا، لیکن یہ دیکھ لینا کہ وہ صرف تمھارے شکار کرنے ہی سے مرا ہو، کسی اور چوٹ یا کسی درندے کے کھانے سے اس کی موت نہ ہوئی ہو۔

۲۔ انسانی فطرت میں پاکیزگی اور صفائی کا داعیہ رکھا گیا ہے۔ دین اسلام تزکیہ کا دین ہے، اس چیز کو ہمیشہ سامنے رکھتا ہے کہ ہم ان چیزوں سے بچیں جو پاکیزہ نہ ہوں۔ گلے سڑے جانور کو ہم مردار جیسا سمجھتے ہیں، اس لیے اس کو نہیں کھاتے۔ اسی مقصد سے قرآن مجید نے یہ حکم دیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ. (البقرہ ۲: ۱۷۲)

''اہل ایمان، جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تم کو عطا فرمائی ہیں، ان کو کھاؤ اور اگر اللہ ہی کے بندے ہو تو اس (کی نعمتوں) کا شکر بھی ادا کرو۔''

اس آیت میں پاکیزہ چیزوں کے کھانے کا حکم دیا گیا ہے، اس لیے بدبودار اور گلی سڑی چیزوں سے دور رہا جائے گا۔ اس حدیث میں یہی بات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی کہ تم اس شکار کو اس وقت نہ کھانا، جب وہ گل سڑ کر بدبودار ہو گیا ہو۔

# متن کے حواشی

۱۔ یہ روایت مسند احمد، رقم ۱۹۳۸۸ سے ہے۔ یہ روایت درج ذیل مقامات پر آئی ہے:

سنن ابی داؤد، رقم ۲۸۴۹، ۲۸۶۱، ۲۸۵۳؛ السنن الکبریٰ، رقم ۴۸۱۲ - ۴۸۱۵؛ سنن النسائی، رقم ۴۳۰۳؛ صحیح مسلم، رقم ۱۹۳۱؛ مسند الامام احمد بن حنبل، رقم ۱۷۷۶۹، ۱۹۳۹۵؛ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۱۹۶۷۸، ۱۹۶۸۹، ۱۹۶۹۰؛ مصنف عبدالرزاق، رقم ۸۴۵۶، ۸۴۵۸، ۸۴۶۱۔

یہی مضمون کچھ مختلف طریقے سے اس طرح بھی آیا ہے:

أن رجلاً أتى النبي صلى اللّٰه عليه وسلم فقال يا رسول اللّٰه إن لي كلاَبًا مكلبة فأفتني فيها قال ما أمسك عليك كلابك فكل قلت وإن قتلن قال وإن قتلن قال أفتني في قوسي قال ما رد عليك سهمك فكل قال وإن تغيب علي قال وإن تغيب عليك ما لم تجد فيه أثر سهم غير سهمك أو تجده قد صل.

''ایک آدمی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور بولا کہ یا رسول اللہ، میرے پاس سدھائے ہوئے کتے ہیں، ان کے بارے میں دینی حکم بتائیے۔ آپ نے فرمایا: جو چیز تیرے یہ کتے تیرے لیے روک لیں، اسے کھا سکتے ہو۔ (کہتے ہیں) میں نے کہا: خواہ وہ شکار کو مار ڈالیں، آپ نے فرمایا: ہاں، اگرچہ وہ اسے مار ڈالیں۔ پھر اس نے کہا کہ مجھے تیر کمان سے مارے گئے شکار کے بارے میں بھی بتائیے۔ آپ نے فرمایا: جو تیرا تیر تجھے دلا دے، وہ بھی کھاؤ تو اس آدمی نے پوچھا کہ خواہ وہ شکار تیر لگنے کے بعد غائب ہو گیا ہو۔ آپ نے فرمایا: ہاں، اگرچہ وہ غائب بھی ہو گیا، لیکن ایسا نہ ہو کہ اس میں تمھارے تیر کے علاوہ کسی اور تیر کا نشان ہو یا وہ گل سڑ گیا ہو۔''

یہ روایت اس طرح کے اسلوب میں ان مقامات میں آئی ہے: سنن النسائی، رقم ۴۲۹۶؛ سنن البیہقی الکبریٰ، رقم ۱۸۶۸۹-۱۸۶۹۰، ۱۸۶۹۲۔

۲۔ یہ اضافہ مصنف عبدالرزاق، رقم ۸۴۵۶ سے ہے۔ یہی بات اسی کتاب میں رقم ۸۴۶۱ میں مذکور ہے۔

۳۔ یہ اضافہ مسند احمد، رقم ۱۹۳۹۵ سے ہے۔ یہ بات مختلف الفاظ کے ساتھ ان روایتوں میں بھی آئی ہے: السنن الکبریٰ، رقم ۴۸۱۴؛ مسند احمد، رقم ۱۹۳۹۵؛ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۱۹۶۹۰، ۱۹۶۸۴۔

۴۔ یہ اضافہ مسند احمد، رقم ۱۷۷۷۹ سے کیا گیا ہے۔

طالب محسن

# نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مؤذن

عَنِ ابْنِ عُمَرَ (رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ) قَالَ: کَانَ لِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مُؤَذِّنَانِ: بِلَالٌ وَابْنُ أُمِّ مَکْتُوْمٍ الْأَعْمٰی.

---

حضرت ابن عمر (رضی اللہ عنہ) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو مؤذن تھے: بلال (رضی اللہ عنہ) اور ابن ام مکتوم (رضی اللہ عنہ) اور یہ نابینا تھے۔

عَنْ عَائِشَۃَ (رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہَا) قَالَتْ: کَانَ ابْنُ أُمِّ مَکْتُوْمٍ یُؤَذِّنُ لِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَھُوَ أَعْمٰی.

---

حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) بیان کرتی ہیں کہ حضرت ابن ام مکتوم (رضی اللہ عنہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اذان دیا کرتے تھے اور یہ نابینا تھے۔

## لغوی مباحث

'ابن ام مکتوم': ان کا نام عمرو بن قیس تھا۔ یہ مکہ میں اسلام قبول کرنے والوں میں سے تھے۔ غزوات کے لیے

نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے باہر گئے تو متعدد مواقع پر انھیں اپنا نائب مقرر کیا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں جس نابینا کا ذکر ہوا ہے، وہ یہی تھے۔ انھوں نے قادسیہ کے دن وفات پائی۔

## معنی

امام مسلم نے اس روایت پر ''ایک مسجد کے لیے دو مؤذن مقرر کرنے کا استحباب'' کا عنوان لگایا ہے۔ گویا ان کے نزدیک اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسجد کے لیے ایک سے زیادہ مؤذن مقرر کیے جا سکتے ہیں اور یہ بھی کہ ایسا کرنا پسندیدہ ہے۔ بعض شارحین نے اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے چار مؤذن مقرر کرنے تک کو موزوں قرار دیا ہے۔

اس روایت سے اصلاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کن صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو اذان دینے کی سعادت حاصل تھی۔ باقی رہا یہ سوال کہ ایک مسجد میں کتنے لوگ مؤذن ہو سکتے ہیں؟ تو اس کا تعلق تدبیر سے ہے۔ ہر مسجد کا مقام و محل اور ضروریات ہی طے کریں گی کہ یہاں ہونے والے مختلف کاموں کے لیے کتنے آدمی درکار ہیں۔ ہمارے دین کا مزاج یہ ہے کہ وہ تدبیر سے متعلق امور کو بالعموم زیر بحث نہیں لاتا اور اس معاملے میں وہ عمل کرنے والوں کے عقل و فہم پر اعتماد کرتا ہے۔ اذان دینے کے اہتمام سے متعلق بھی دین میں یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ اگر دین میں اس حوالے سے کوئی تحدید مطلوب ہوتی تو وہ بات صریح اسلوب میں بیان کر دی جاتی۔ اس حوالے سے جتنی روایات میری نظر سے گزری ہیں، ان سے یہی بات سامنے آتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اذان دینے کا معاملہ ایک تدبیری معاملہ ہی تھا اور جو کچھ وقوع پذیر ہوا، اسی حیثیت سے وقوع پذیر ہوا۔

فقہ و حدیث کی کتابوں میں اس طرح کی مثالیں عام ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے زمانے کے اس نوع کے واقعات سے اسی نوع کے دینی مفاہیم اخذ کیے گئے ہیں۔ اس کا ایک خاص سبب ہے اور وہ یہ ہے کہ صحابۂ کرام کا عمومی مزاج تعمیل کا تھا اور وہیں رکنے کو ترجیح دیتے تھے، جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم عمل و فکر میں انھیں چھوڑ کر گئے تھے۔ یہی چیز بعد میں تابعین اور تبع تابعین میں بھی جھلکتی نظر آتی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صحابہ کے ہاں تدبیر اور شریعت کا فرق نہیں تھا۔ اصل یہ ہے کہ امتثال امر کے جذبے کے تحت وہ اس طرح ڈھل گئے تھے کہ وہ عمل میں زیادہ سے زیادہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ و عادت کے قریب رہیں۔ ہمارے نزدیک یہ جذبہ ہر لحاظ سے لائق تحسین ہے، لیکن دین کا فہم اور احکام کی صحیح نوعیت کو طے کرنا ایک علمی کام ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ حکم کی صحیح

نوعیت واضح کر دی جائے۔ چنانچہ ہمارے نزدیک یہ روایت محض حضور کے زمانے کے عمل کو بیان کرتی ہے، اس سے کوئی دینی حکم مستنبط نہیں ہوتا۔

دوسری روایت پر ''اندھے کی اذان کا جواز، جبکہ اس کے ساتھ بینا بھی ہو'' کا عنوان قائم کیا گیا ہے۔ اذان دینے کی دو ضرورتیں ہیں: ایک تو یہ کہ آدمی بلند آواز ہو اور دوسرے یہ کہ وہ وقت کی تعیین کر سکتا ہو۔ نابینا آدمی کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ یہ طے کر سکے۔ غالباً اسی وجہ سے بینا کے ساتھ ہونے کی شرط عائد کی گئی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ مسئلہ بھی محض تدبیر کا ہے۔ تدبیر ہی کا تقاضا ہے کہ آدمی خوش آواز اور بلند آہنگ ہو۔ اذان چونکہ متعین وقت پر دی جاتی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اذان دینے والا خود وقت کی پہچان کر سکتا ہو یا اسے صحیح وقت بتا دیا جائے۔ اس مسئلے میں اتنا حصہ تو دینی ہے کہ اذان صحیح وقت پر دی جائے، لیکن مؤذن صحیح وقت کیسے معلوم کرے، یہ محض تدبیر ہے اور اس کی کوئی بھی صورت اختیار کی جا سکتی ہے۔ مثلاً موجودہ زمانے میں اندھوں کے لیے گھڑیاں ایجاد ہو چکی ہیں۔ چنانچہ وہ اگر گھڑی سے وقت معلوم کر کے اذان دے دے اور کوئی بینا اس کے ساتھ نہ ہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔

## متون

اس روایت کے بیان ہونے کا محرک کیا ہے؟ اس سوال کے دو تین جواب ممکن ہیں: ایک یہ کہ سیرت کا ایک پہلو بیان کرنا مقصود ہے۔ دوسرے یہ کہ، جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے، کسی فقہی اشکال کے ضمن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے عمل کو بطور شاہد پیش کیا گیا ہے۔ تیسرے یہ کہ حضور کے کسی ارشاد کے پس منظر کو واضح کرنے کے لیے یہ بات کہی گئی ہے۔ اس روایت کے متون کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ سحری سے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی تمہید ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ جب بلال اذان دیں تو کھانا پینا بند نہ کیا کرو۔ البتہ اگر ابن ام مکتوم اذان دیں تو کھانا پینا بند کر دیا کرو۔ اس کی وجہ بھی بعض روایتوں میں مذکور ہے کہ ابن ام مکتوم اس وقت اذان دیتے تھے جب لوگ انھیں کہتے تھے کہ صبح طلوع ہو گئی ہے، جبکہ حضرت بلال ذرا اندھیرے میں اذان دیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے حضور کے اس ارشاد کی تمہید میں بعض رواۃ کو یہ بتانا ضروری معلوم ہوا کہ آپ کے زمانے میں مسجد نبوی میں دو لوگ اذان دیا کرتے تھے۔ ابن خزیمہ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ نے یہ پوری بات اس سوال کے جواب میں فرمائی تھی کہ آپ وتر کب پڑھتی ہیں۔

اس روایت کے اس تفصیلی متن میں جو بات بیان ہوئی ہے، اس کو سمجھنے میں کچھ مشکلات ہیں۔ آگے ''کتاب الصوم''

میں روایت کا یہ حصہ زیر بحث آئے گا، وہاں ان شاءاللہ اس پر تفصیل سے بحث ہوگی۔

پہلی روایت میں حضور کے دو مؤذنوں کا ذکر ہے۔ کچھ راویوں کو حضرت ابومحذورہ کے نظر انداز ہونے کا اندیشہ ہوا ہے۔ چنانچہ بعض روایات میں تین مؤذن ہونے کا ذکر بھی ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ مسجد قبا اور بعض دوسری مساجد میں بھی حضور کے زمانے میں لوگ اذان دیتے رہے ہیں۔ چنانچہ اس طرح کی کوئی روایت محض تکلف ہے۔

پہلی روایت میں دو مؤذن مقرر ہونے کو بیان کیا گیا ہے۔ دوسری روایت میں حضرت ابن ام مکتوم کے مقرر ہونے کا ذکر ہے۔ یہ بات ان روایتوں کے مختلف متون میں مترادف اسالیب میں بیان ہوئی ہے۔

## کتابیات

موطا، رقم ۱۶۱؛ بخاری، رقم ۵۹۲؛ مسلم، رقم ۳۸۰-۳۸۱؛ ابوداؤد، رقم ۵۳۵؛ نسائی، رقم ۶۳۷-۶۴۰؛ ترمذی، رقم ۳۰۲؛ احمد، رقم ۲۵۵۶۱؛ ابن حبان، رقم ۳۴۶۹؛ ابن خزیمہ، رقم ۷۰۴؛ دارمی، رقم ۱۱۹۱؛ بیہقی، رقم ۱۶۶۵-۱۶۶۶، ۱۸۵۴، ۱۸۶۲-۱۸۶۳؛ عبدالرزاق، رقم ۷۶۱۱، ۱۸۰۱، ۱۸۱۹-۱۸۲۰، ۱۸۸۴، ۱۸۸۶؛ ابویعلیٰ، رقم ۵۴۳۲، ۵۴۹۲، ۵۵۴۱؛ مسند الشامیین، رقم ۳۱۴۱؛ سنن کبریٰ، رقم ۱۶۰۱-۱۶۰۴؛ طیالسی، رقم ۱۶۶۱؛ اسحاق بن راہویہ، رقم ۹۳۴، ۱۵۲۲-۱۵۲۳؛ المعجم الکبیر، رقم ۴۸۱؛ ابن ابی شیبہ، رقم ۲۳۱۰۔

---

محمد عمار خان ناصر

# سرقہ کا نصاب

قرآن مجید میں چوری کی سزا کا حکم ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

| | |
|---|---|
| وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ. (المائدہ ۵: ۳۸) | ”اور چور مرد اور چور عورت کا ہاتھ کاٹ دو۔ یہ ان کے عمل کی پاداش اور اللہ کی طرف سے عبرت کا نشان ہے۔ اور اللہ غالب، حکمت والا ہے۔“ |

یہ حکم، جیسا کہ واضح ہے، ایک اصولی نوعیت کا حکم ہے اور قرآن نے اپنے اسلوب کے مطابق اس کی اطلاقی تفصیلات ۔ مثلاً یہ کہ چور کے دونوں ہاتھ کاٹے جائیں یا ایک اور اگر ایک تو کون سا ہاتھ کہاں سے کاٹا جائے؟ ـــــ سے صراحتاً تعرض نہیں کیا، تاہم حکم کے الفاظ اور اس کو محیط عقلی قرائن اس حوالے سے پوری رہنمائی فراہم کرتے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھی کی روشنی میں اپنے عمل کے ذریعے سے ان پہلوؤں کی وضاحت فرمائی ہے۔

روایات میں نوعیت کے اعتبار سے چوری کی مختلف صورتوں میں جو فرق کیا گیا ہے، اس کی اساس بھی ہمارے نزدیک یہی ہے۔ قرآن مجید نے قطع ید کی سزا درحقیقت باعتبار لغت 'سرقہ' کے ارتکاب پر نہیں، بلکہ عقل عام اور اخلاقیات قانون کے مسلمہ تصورات کے تناظر میں اس صورت کے لیے بیان کی ہے جب باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے مالک کی حفاظت اور نگرانی میں پڑے ہوئے کسی مال کو چرایا جائے۔ اتفاقاً موقع پا کر کسی غیر محفوظ چیز کو اٹھا لینا سرے سے اس کے دائرۂ اطلاق میں ہی نہیں آتا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کی وضاحت کرتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص راستے میں چلتے ہوئے کسی کے باغ سے کچھ پھل توڑ لے یا کسی کھلی جگہ پر بغیر حفاظت کے پڑے ہوئے غلے میں سے کچھ لے لے یا راہ چلتے کسی جانور کو ہنکا لے جائے تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جا سکتا۔[1]

امام شافعی نے حکم کو محیط ان عقلی قرائن کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ رائے قائم کی ہے کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

[1] نسائی، رقم ۴۸۷۳۔

چوری کی مذکورہ صورتوں کو قطع ید سے مستثنیٰ قرار نہ دیا ہوتا تو قرآن مجید کے ظاہر کی رو سے ہر اس شخص کا ہاتھ کاٹنا لازم ہوتا جس نے 'سرقہ' کا ارتکاب کیا ہو۔[2] حالانکہ ہماری بیان کردہ توجیہ سے واضح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان کردہ استثنا قرآن کے عموم میں کوئی تخصیص پیدا نہیں کرتا، بلکہ درحقیقت 'سرقہ' کے صحیح مصداق کی تعیین وتوضیح کی حیثیت رکھتا ہے اور اگر آپ کی تصریحات موجود نہ ہوتیں تو بھی قانونی دانش ان صورتوں کو قرآن کی بیان کردہ سزا سے لازماً مستثنیٰ قرار دیتی۔ یہی وجہ ہے کہ فقہا نے اس استثنا کو منصوص صورتوں تک محدود رکھنے کے بجائے اسے ایک عمومی ضابطے پر محمول کیا ہے اور اس کی روشنی میں چوری کی بہت سی دیگر صورتوں کو بھی قطع ید سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔

اس ضمن میں چوری کی سزا کے نفاذ کے لیے مسروقہ مال کی مقدار کا مسئلہ بالخصوص توجہ طلب ہے۔ قرآن نے یہاں کسی مخصوص نصاب کی شرط کی تصریح نہیں کی، لیکن یہ شرط حکم کے پس منظر میں موجود ہے، اس لیے کہ قانون کا موضوع جرم کی اسی صورت کو بنایا جاتا ہے جسے عقلاً وعرفاً کسی باقاعدہ قانونی سزا کا مستوجب سمجھا جائے، جبکہ یہ بات معلوم ہے کہ معمولی اور حقیر چیزوں کی چوری سے صرف نظر کیا جاتا ہے اور اس ضمن میں قانون کو بالعموم حرکت میں نہیں لایا جاتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم میں مضمر اسی شرط کو واضح کرتے ہوئے چور کا ہاتھ کاٹنے کے لیے ایک ڈھال کی قیمت کو معیار قرار دیا اور آپ کے دور میں عمومی طور پر اسی پر عمل ہوتا رہا۔ ام المومنین حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کسی چور کا ہاتھ ایک زرہ یا ڈھال سے کم قیمت کے مال میں نہیں کاٹا گیا۔[3]

یہاں تنقیح طلب سوال یہ ہے کہ کیا ڈھال کو معیار قرار دینے کا حکم شرعی حیثیت رکھتا ہے اور ہر زمانے میں ہر معاشرے کے لیے اسی کو واجب الاتباع معیار کی حیثیت حاصل ہے؟ فقہا نے ڈھال کی قیمت کی تعیین میں اختلاف کے باوجود اصولی طور پر ڈھال ہی کو شریعت کا مقرر کردہ غیر متبدل نصاب سرقہ قرار دیا ہے، تاہم اکابر صحابہ اور تابعین کی آرا سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس میں مقرر کردہ معیار، یعنی ڈھال کی قیمت کو نہیں، بلکہ اس کے پیچھے کارفرما اصول، یعنی قیمتی اور غیر قیمتی چیز میں فرق کو اصل اہمیت کا حامل سمجھتے تھے۔ چنانچہ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

| | |
|---|---|
| لم تقطع يد سارق على عهد النبى صلى الله عليه وسلم فى ادنى من ثمن المجن ترس او حجفة وكان كل واحد منهما ذا ثمن. | ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کسی چور کا ہاتھ زرہ یا ڈھال سے کم قیمت چیز میں نہیں کاٹا گیا اور یہ دونوں چیزیں قیمتی تھیں۔'' |

(بخاری، رقم ۶۲۹۶)

ایک دوسری روایت میں فرماتی ہیں:

لم يكن يقطع على عهد النبی صلی اللّٰه علیه و سلم فی الشئ التافه. (مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۸۱۱۴)

”نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں معمولی چیز کی چوری پر ہاتھ نہیں کاٹا جاتا تھا۔“

اسی طرح جلیل القدر تابعی عروہ بن زبیر فرماتے ہیں:

كان السارق على عهد النبی صلی اللّٰه علیه و سلم يقطع فی ثمن المجن و كان المجن يومئذ له ثمن ولم يكن يقطع فی الشئ التافه. (مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۸۱۱۰)

”نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں چور کا ہاتھ ایک ڈھال کی قیمت میں کاٹا جاتا تھا، کیونکہ اس وقت ڈھال ایک قیمتی چیز سمجھی جاتی تھی۔ کسی معمولی چیز کی چوری پر ہاتھ نہیں کاٹا جاتا تھا۔“

صحابہ کے فتاویٰ اور فیصلوں کے مطالعہ سے بھی یہی بات واضح ہوتی ہے کہ انھوں نے مختلف مقدمات میں، مقدمے کی نوعیت کے لحاظ سے، کسی مخصوص نصاب کی پابندی کیے بغیر قطع ید کی سزائیں دی یا تجویز کی ہیں اور قیمتی اور غیر قیمتی اشیا میں اپنے اپنے ذوق اور صواب دید کے لحاظ سے فرق قائم کیا ہے:

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایت ہے کہ انھوں نے لوہے کا ایک خود چرانے پر جس کی قیمت ایک چوتھائی دینار تھی، چور کا ہاتھ کاٹ دیا۔[۴]

ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ چور کا ہاتھ ایک چوتھائی دینار یا اس سے زیادہ قیمت کی چیز چرانے پر کاٹا جائے گا۔[۵]

انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک ایسی چیز کی چوری پر چور کا ہاتھ کاٹ دیا جس کو میں پانچ یا تین درہم میں بھی لینا پسند نہ کرتا۔[۶]

---

۲؎ الرسالہ ۲۷۔

۳؎ بخاری، رقم ۶۲۹۶۔

۴؎ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۸۰۸۹۔

۵؎ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۸۰۹۱۔

۶؎ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۸۰۹۲۔

عمرہ بیان کرتی ہیں کہ عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک مقدمے میں تین درہم کا ایک لیموں چرانے پر چور کا ہاتھ کاٹ دیا۔[7]

لیکن ایک دوسرے مقدمے میں ایک آدمی کو، جس نے کپڑا چرایا تھا، حضرت عمر کے پاس لایا گیا تو انھوں نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، تاہم حضرت عثمان نے کہا کہ اس کپڑے کی قیمت دس درہم سے کم ہے۔ چنانچہ تحقیق کی گئی تو اس کپڑے کی قیمت آٹھ درہم نکلی پس حضرت عمر نے اس کا ہاتھ نہیں کاٹا۔[8]

ابوہریرہ اور ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انھوں نے چار درہم سے کم کی چوری میں ہاتھ کاٹنے کو درست قرار نہیں دیا۔[9]

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ پانچ انگلیوں کا ہاتھ پانچ درہم چرانے پر ہی کاٹا جائے گا۔[10] عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے جوتوں کا ایک جوڑا چرانے پر چور کا ہاتھ کاٹ دیا۔[11]

ابن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ کچھ لوگ مکے کے راستے میں لوگوں کے چابک چرایا کرتے تھے۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ اگر دوبارہ تم نے ایسا کیا تو میں تمھارے ہاتھ کاٹ دوں گا۔[12]

اسی پہلو کو پیش نظر رکھتے ہوئے دور اول میں فقہا کے ایک گروہ نے ڈھال یا اس کی قیمت کو معیار ماننے یا صحابہ سے منقول فتاویٰ اور فیصلوں میں سے کسی کو اختیار کرنے کے بجائے قیاس کے اصول پر ایک دوسرا معیار پیش کیا اور کہا کہ چونکہ بکریوں کی زکوٰۃ کا نصاب کم سے کم چالیس بکریاں ہے، اس لیے چور کا ہاتھ کاٹنے کے لیے بھی کم از کم چالیس درہم کو نصاب قرار دینا چاہیے۔[13]

داؤد اصفہانی نے اسی بنیاد پر یہ راے اختیار کی ہے کہ قلیل یا کثیر مال کی حد بندی اور اس کی بنیاد پر نصاب سرقہ کی تعیین کا مدار اصلاً عرف و عادت پر ہے۔ امام رازی، ان کے استدلال کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

۷؎ الموطا، رقم ۱۳۱۱۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۸۰۹۶۔

۸؎ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۸۱۱۲۔

۹؎ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۸۰۹۵۔

۱۰؎ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۸۰۹۹۔

۱۱؎ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۸۱۰۰۔

۱۲؎ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۸۱۰۱۔

۱۳؎ سرخسی، المبسوط ۹/ ۱۳۷۔

نحن لا نوجب القطع فی سرقة الحبة الواحدة ولا فی سرقة التبنة الواحدة بل فی اقل شئ یجری فیہ الشح والضنة وذلك لان مقادیر القلة والکثرة غیر مضبوطة فربما استحقر الملك الکبیر آلافًا مولفة وربما استعظم الفقیر طسوجًا... ولما کانت مقادیر القلة والکثرة غیر مضبوطة وجب بناء الحکم علی اقل ما یسمی مالاً.

(رازی، مفاتیح الغیب ۱۷۸/۶)

''ہم ایک دانے یا ایک تنکے کی چوری پر نہیں، بلکہ اس کم سے کم مقدار پر قطع ید کو لازم ٹھہراتے ہیں جس کے بارے میں انسان اپنے اندر بخل اور کنجوسی محسوس کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قلت اور کثرت کی کوئی متعین مقدار طے نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ ایک عظیم بادشاہ ہزاروں لاکھوں کی رقم کو حقیر سمجھ سکتا ہے، جبکہ ایک فقیر ممکن ہے کہ ایک طسوج کو بھی بہت بڑی چیز خیال کرے۔ چونکہ قلت اور کثرت کی کوئی متعین مقدار طے نہیں کی جا سکتی، اس لیے قطع ید کے حکم کا مدار اس کم سے کم مقدار پر رکھنا پڑے گا جسے مال کہا جا سکتا ہو۔''

اب اگر سرقہ میں نصاب مقرر کرنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ معمولی چیزوں کی چوری پر سزا نہ دی جائے، بلکہ کسی ایسی چیز کی چوری پر قطع ید کی سزا نافذ ہو جو عقلاً و عرفاً کسی خاص قدر و قیمت کی حامل ہو تو ظاہر ہے کہ ہر معاشرے کا عرف مختلف ہوتا ہے اور اس میں قدر و قیمت رکھنے والی چیزیں بھی ایک جیسی نہیں ہو سکتیں۔ عرب کے بدوی معاشرے میں ڈھال وغیرہ کو ایک قیمتی چیز کی حیثیت حاصل تھی اور اس بنا پر اس کو معیار مقرر کرنا بھی درست تھا، لیکن ظاہر ہے کہ دوسرے معاشروں میں صورت حال اس سے مختلف ہے۔ اس بات کو درست مان لینے کا تقاضا یہ ہے کہ ڈھال کو تمام معاشروں اور زمانوں کے لیے معیار قرار دینے کے بجاے اس کا تعین ہر علاقے اور ہر دور کے اہل حل و عقد کی صواب دید پر چھوڑ دیا جائے جو اپنے اپنے عرف، ضروریات اور حالات کے لحاظ سے حد سرقہ کے لیے نصاب متعین کریں۔

ریحان احمد یوسفی

# اندھیرا چھٹ جائے گا

اقوام عالم کی ہزارہا برس کی تاریخ کا سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ قوموں کی تقدیر کا فیصلہ ان کو پیش آنے والے اچھے برے حالات نہیں کرتے، بلکہ وہ فکری قیادت کرتی ہے جو ان کو زندگی گزارنے کا ڈھنگ سکھاتی اور ان کے لیے راہِ عمل طے کرتی ہے۔ کسی قوم کے حالات بہت برے ہوں اور اس کے فکری رہنما بہت مثبت سوچ کے حامل ہوں تو قوم بدترین بحرانوں سے نکل آتی ہے، اس کے برعکس قوم کے حالات اچھے ہوں، مگر اس کے رہنما منفی سوچ سے نہ اٹھ سکیں تو بہترین امکانات کی قوم بھی بربادی کا شکار ہو جاتی ہے۔

تاریخ کے اس سبق کی سب سے نمایاں مثال خود پاکستان ہے۔ ایک صدی قبل اس خطے کے مسلمان غلامی، محرومی، پستی اور ذلت کا شکار تھے۔ پورا عالم اسلام ایک ایسی سیاسی، ذہنی اور معاشی غلامی کا شکار تھا جس سے نکلنے کے امکانات دور دور تک نظر نہ آتے تھے۔ مگر ایسے میں سر سید اور علامہ اقبال جیسے عظیم لوگ پیدا ہوئے۔ ان دونوں کی مشترکہ خصوصیت یہ تھی کہ بدترین حالات کے باجود انھوں نے امید کے دیے روشن کیے اور اُس وقت کے حالات میں ایک ممکنہ طور پر بہترین لائحۂ عمل کی طرف قوم کی رہنمائی کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ صرف نصف صدی میں دنیا کی پانچویں اور مسلمانوں کی سب سے بڑی ریاست ظہور پذیر ہوئی۔

بدقسمتی سے قیام پاکستان کے بعد ہم مسلسل ایک تنزل کا شکار ہیں۔ یہ زوال کیوں ظہور پذیر ہوا، سر دست اس کو جانے دیجیے، لیکن اہم بات یہ ہے کہ اب ہم اس زوال کی انتہا کو پہنچ چکے ہیں۔ اس زوال کے باجود ہمارے آج کے حالات ایک صدی پہلے کے حالات سے بہت بہتر ہیں۔ بلاشبہ آج ہم ایک بدترین جمہوری دور سے گزر رہے ہیں، لیکن ہم نے

یہ جان لیا ہے کہ بدترین جمہوریت بہترین آمریت سے بہتر ہوتی ہے۔ سیاسی، معاشی اور قومی سلامتی کے اعتبار سے ہمیں سخت حالات کا سامنا ہے، لیکن ساتھ ہی ہمیں یہ ادراک ہو چکا ہے کہ یہ سب ٹھیک نہیں ہو رہا۔ یہ ادراک کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔ جس قوم کے اعلیٰ اذہان میں یہ شعور پیدا ہو جائے وہ چند برسوں میں حالات کا رخ اپنے حق میں پھر دیتے ہیں۔

آج پاکستانی قوم اپنی بقا کی آخری جنگ لڑ رہی ہے۔ اس جنگ میں ہم نے حال ہی میں آمریت کو شکست دی ہے، مگر جمہوری رہنماؤں کی عاقبت نااندیشی کے ہاتھوں وقتی شکست کھائی ہے۔ قوموں کی زندگی میں وقتی پسپائی کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ ہم اس وقت عارضی پسپائی کا سامنا کر رہے ہیں۔ مگر چند برسوں کے اندر لازماً ہم بہتری کی طرف جائیں گے۔

اِس وقت کرنے کا سب سے اہم کام یہ ہے کہ ہم اقبال اور سرسید کی رہنمائی کو زندہ کریں۔ سرسید نے تعلیم کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا تھا۔ ایک ایسے وقت میں جب سارے امکانات ختم نظر آتے تھے انھوں نے علم کے میدان کو قوم کے سامنے رکھا اور کچھ ہی عرصے میں قوم کے بہترین لوگوں میں تعلیم حاصل کرنے کی لگن پھونک دی۔ جس کے نتیجے میں آنے والے چند برسوں میں اعلیٰ ترین رہنماؤں کی ایک کھیپ سامنے آ گئی۔

اقبال نے مایوسی اور بے یقینی کی شکار قوم میں امید کا دیا جلایا اور اس کے افراد میں یقین اور اعتماد کی طاقت پیدا کر دی تھی۔ قوم کے حال پر چھائی شکست کی تلافی کے لیے اقبال نے قوم کا تعلق اس کے عظیم ماضی سے جوڑا اور اس کے افراد کو یقین دلا دیا کہ وہ اگر حوصلے سے کام لیں تو مستقبل ان کا ہے۔ اس یقین نے قوم میں جرات اور ہمت کی وہ طوفانی لہر پیدا کی جو آنے والے دنوں میں انگریزوں اور ہندوؤں کی طاقت اور مخالفت کو اپنے زور میں بہا کر لے گئی۔

آج بھی قوم کے باشعور لوگوں کے کرنے کا اگر کوئی کام ہے وہ تو یہی ہے کہ قوم میں تعلیم کا صور پھونکیں اور امید و یقین کی شمع روشن رکھیں۔ بہت جلد ہر اندھیرا چھٹ جائے گا

خالد مسعود

# بنو ہاشم کا مقاطعہ اور دعوت مصالحت

[''سیر و سوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین
کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

جوں جوں قریش کو احساس ہوتا کہ نئے دین سے متعلق معاملات ان کی گرفت میں نہیں آ رہے ہیں تو وہ اہل ایمان اور ان کے معاونین کے خلاف ایک کے بعد دوسرا سخت اقدام تجویز کرتے تا کہ ان کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر سکیں اور نئے دین کی دعوت کامیاب نہ ہونے پائے۔ بنو ہاشم نے چونکہ آنحضرت کو تحفظ فراہم کر رکھا تھا اور قریش متعدد کوششیں کرنے کے باوجود ابو طالب کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت سے دست بردار کرنے میں ناکام ہو چکے تھے۔ اس لیے قدرتی طور پر بعض جذباتی لوگوں نے خود بنی ہاشم ہی کو اس حمایت کی سزا دینے کا فیصلہ کیا۔ اس کی شکل ان کو معاشرتی مقاطعہ کی سوجھی۔

## مقاطعہ کی معروف روایت

عام طور پر سیرت نگاروں نے مقاطعہ کے بارے میں جس روایت پر انحصار کیا ہے وہ یوں ہے کہ جب قریش کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نجاشی کے اظہار عقیدت اور مسلمانوں کے لیے خیر سگالی کے جذبات گراں گزرے تو انھوں نے رسول اللہ کو، معاذ اللہ، قتل کرنے پر اتفاق کر لیا۔ انھوں نے بنو ہاشم کے خلاف ایک معاہدہ تحریر کیا کہ جب تک یہ خانوادہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ان کے حوالہ نہیں کر دیتا، قریش کا کوئی خاندان بنو ہاشم سے نہ تو شادی اور نکاح کا تعلق جوڑے

گا، نہ ان سے تجارت کرے گا، اور نہ ان سے میل جول رکھے گا۔ یہ معاہدہ تحریر کر کے خانہ کعبہ کے اندر لٹکا دیا گیا۔ روایت کے مطابق اس معاہدہ کے تحت کارروائی کرتے ہوئے محرم ۷ نبوی میں بنو ہاشم اور ان کے حمایتی بنو مطلب کو شعب ابی طالب میں محصور کر دیا گیا۔ نہ ان کے پاس کھانے کی کوئی چیز جانے دی جاتی اور نہ بیرونی تاجروں سے ان کو کچھ خریدنے دیا جاتا۔ وہ بیریوں کے پتے کھا کھا کر گزارا کرتے۔ سعد بن ابی وقاص کی بھوک کے مارے یہ حالت ہوگئی کہ ان کو سوکھا ہوا چمڑا ہاتھ لگا تو اسی کو آگ پر بھون کر انھوں نے چبالیا اور پانی سے نگل لیا۔ بعض اچھے لوگ کسی جانور پر غلہ لاد کر شعب ابی طالب کی طرف ہانک دیتے۔ بنو ہاشم کے بچے بھوک سے بلکتے تو قریش ان کی آوازیں سن سن کر خوش ہوتے۔ بنو ہاشم نے یہ مصیبتیں تین سال تک جھیلیں۔ بالآخر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوطالب کو بتایا کہ معاہدہ کی دستاویز کو دیمک نے چاٹ لیا ہے۔ ابوطالب کفار کے پاس گئے اور کہا کہ معاہدہ پیش کرو۔ میرے بھتیجے کے کہنے کے مطابق اس میں کوئی تحریر نہیں۔ اگر اس کی بات غلط ثابت ہوئی تو میں اس کو تمھارے حوالے کر دوں گا۔ جب معاہدہ لایا گیا تو معلوم ہوا کہ اس کی تحریر دیمک کے ہاتھوں محو ہو چکی ہے۔ اس موقع پر قریش کے بعض وسیع الظرف سرداروں مثلاً مطعم بن عدی، ابوالبختری بن ہاشم، زمعہ بن الاسود، عدی بن قیس اور زہیر بن ابی امیہ نے یہ موقف اختیار کیا کہ ہم یہ ظلم مزید نہیں ہونے دیں گے اور وہ محصورین کو گھاٹی سے نکال لائے۔ وہ اس سے قبل بھی اس ظالمانہ معاہدہ کے خلاف آواز بلند کرتے رہے تھے۔

اس روایت کی رو سے قریش کا ہر خانوادہ اس بات کا پابند تھا کہ وہ:

(ا) بنو ہاشم سے شادی بیاہ کا تعلق قائم نہیں کرے گا۔

(ب) ان سے تجارت نہیں کرے گا۔ اور

(ج) ان سے میل جول نہیں رکھے گا۔

جب تک کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے حوالے نہیں کر دیتے کہ قریش ان سے نجات حاصل کر سکیں۔

اس مضمون کی دوسری روایات تفصیلات میں باہم مختلف ہیں۔ بعض روایات کی رو سے قریش نے بنو ہاشم کو شعب ابی طالب میں محصور کر دیا لیکن بعض کے نزدیک بنو ہاشم اپنی مصلحت کے تحت یکجا ہو گئے۔ مختلف روایات محصوری کی مدت ۲ سال، ۳ سال یا اس سے کم یا زیادہ بتاتی ہیں۔ دیمک نے معاہدہ کے جس حصہ کو چاٹ لیا تھا اس میں بھی اختلاف ہے کہ وہ ابتدائی الفاظ 'باسمك اللّٰهم' تھے یا یہ الفاظ تو باقی رہ گئے، اصل معاہدہ تلف ہو گیا۔

ہمارے نزدیک ان روایات کے مضمون پر کچھ سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کا کوئی جواب نہیں بن پڑتا۔ مثلاً:

(ا) معاہدہ کی شقوں میں بنو ہاشم کے ساتھ شادی بیاہ اور تجارتی لین دین کی ممانعت تو ہے لیکن ان کا محاصرہ کرنے کی کوئی شق کسی روایت میں موجود نہیں۔ لہٰذا اس معاہدہ کے تحت ان کا محاصرہ کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا اور کوئی قرشی خانوادہ ایسا کرنے کا پابند نہیں تھا۔ جو چیز معاہدہ میں تھی ہی نہیں تو اس پر قریش نے بالاتفاق عمل کیسے کر لیا!

(ب) یہ معاہدہ بنو ہاشم اور ان کے حمایتی بنو مطلب کے خلاف تھا۔ دوسرے خانوادے اس سے متاثر نہیں ہوتے تھے لیکن روایت کی رو سے حضرت سعد بن ابی وقاص کو چمڑے کا ٹکڑا کھاتے ہوئے بتایا گیا ہے جبکہ وہ بنو زہرہ سے تعلق رکھتے تھے۔ سوال یہ ہے کہ وہ محصورین میں کیسے شامل ہو گئے؟ اگر ان کو زبردستی وہاں گھسیٹ لیا گیا تھا تو بنو زہرہ ان کی مدد کو کیوں نہ آئے؟

(ج) معاہدہ کی رو سے صرف قریش پر بنو ہاشم سے تجارت پر پابندی عائد کی گئی۔ غیر قرشیوں یا بیرونی تاجروں پر یہ معاہدہ لاگو نہیں ہوتا تھا۔ اس صورت میں بنو ہاشم کے لیے کوئی رکاوٹ نہ تھی کہ وہ ضرورت کی اشیا دوسرے تاجروں سے حاصل کریں اور اپنے بچوں کو بھوک سے ہلکان نہ کریں۔ لیکن روایت کے مطابق تین سال تک بنی ہاشم بھوکے محصور رہے۔

(د) عرب معاشرہ میں کسی بھی شخص کو قتل کرنا آسان کام نہ تھا۔ قریش کو اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قتل مطلوب تھا تو اس کے لیے فیصلہ کرنے کی بہترین جگہ دارالندوہ تھی جہاں قریش اہم فیصلے پورے سوچ بچار کے بعد اجتماعی طور پر کیا کرتے تھے لیکن اس موقع پر دارالندوہ میں کوئی مجلس منعقد نہیں ہوئی۔ اس سے باہر کیا گیا کوئی بھی اہم فیصلہ قریش کا اجتماعی فیصلہ نہیں کہلاتا تھا، لہٰذا وہ قابل عمل نہیں ہوتا تھا۔ اس واقعہ کے کئی سال بعد وہ وقت آیا جب قریش کے تمام خانوادوں نے دارالندوہ میں جمع ہو کر بڑی بحث و تمحیص کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی تدابیر پر اتفاق کیا۔ چونکہ بعد کا یہ فیصلہ نہایت سنجیدگی کے ساتھ کیا گیا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ کو ان کے دشمنوں سے نجات دی اور آپ کو ہجرت کر جانے کا حکم ہوا۔

(ہ) بنو ہاشم کے محاصرہ کا واقعہ، اور وہ بھی تین سال کے لیے، اگر پیش آیا ہوتا تو یہ اتنا غیر معمولی تھا کہ اس کی صدائے بازگشت پورے عرب میں سنائی دیتی کیونکہ بنو ہاشم حاجیوں کی مہمان داری، ان کو پانی پلانے، بیت اللہ کی دیکھ بھال اور مسافروں کی خدمت پر مامور تھے۔ ان کا اپنی ذمہ داریوں سے غائب ہونا پورے ملک میں ہلچل پیدا کر دیتا۔ تاریخ میں اس بات کا کوئی تذکرہ نہیں ہے کہ بنو ہاشم کو منظر سے ہٹا کر ان کی حج و عمرہ کی منصبی خدمات کے لیے کون سا متبادل نظام وضع کیا گیا تھا۔

ان حقائق کی روشنی میں اس طرح کی مضطرب روایات پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ معاملہ کی شکل وہ نہیں رہی جو ان روایات کی روشنی میں دکھائی دیتی ہے۔

## واقعہ کی ممکن شکل

حضرت ابو ہریرہ حجۃ الوداع کے ضمن میں بیان کرتے ہیں کہ جب ہم منیٰ میں مقیم تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کل ہم بنو کنانہ کی گھاٹی میں اتریں گے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں لوگوں نے کفر کی حمایت میں باہم قسمیں کھائی تھیں۔ قریش اور بنو کنانہ نے بنو ہاشم اور بنو مطلب کے خلاف حلف اٹھایا کہ وہ ان سے نکاح کا رشتہ جوڑیں گے اور نہ تجارت کا معاملہ کریں گے جب تک کہ وہ رسول اللہ کو ان کے حوالہ نہیں کر دیتے[1]۔

یہ روایت اصل حقیقت سے قریب تر معلوم ہوتی ہے۔ اس کی رو سے واقعہ کی جو شکل سامنے آتی ہے وہ کچھ یوں ہے کہ کفار قریش کے ایک طبقہ نے بنو ہاشم اور بنو مطلب (جو بنو ہاشم کا ساتھ دینے میں ثابت قدم رہے تھے) کے معاشرتی مقاطعہ پر باہم حلف اٹھایا جس کے تحت ان کے ساتھ رشتہ نکاح قائم کرنا اور تجارت میں اشتراک یا لین دین ختم کر دیا گیا۔ اس میں کوئی ایسی شق نہ تھی جس کے تحت بنو ہاشم کو خوراک پہنچانا منع کیا گیا ہو یا ان کی نظر بندی مقصود ہو۔ یہ حلف مکہ میں نہیں بلکہ منیٰ کی ایک گھاٹی میں اٹھایا گیا اور اس کی حیثیت حلف اٹھانے والوں کی نظروں میں جو بھی رہی ہو، یہ قریش کا معاہدہ نہیں تھا۔ لہٰذا اس کے لکھنے لکھانے کی نوبت نہیں آ سکتی تھی۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو حسب ذیل نتائج بہ آسانی نکالے جا سکتے ہیں۔

۱۔ یہ قریش کا کوئی ایسا اجتماعی معاہدہ نہیں تھا جو سوچ بچار کے بعد طے پایا ہو یا جسے تحریر کیا گیا ہو اور اس کی کوئی مدت مقرر ہو۔ قریش اور بنو کنانہ کے کچھ لوگوں نے بنی ہاشم کو زچ کرنے کے لیے بنو کنانہ کی گھاٹی میں اکٹھے ہو کر قسمیں کھائیں اور ان کے معاشرتی مقاطعہ کا فیصلہ کیا۔ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ کچھ جذباتی لوگوں نے باہم یہ حلف اٹھایا ہو اور خاندانوں کے بڑے اس میں شامل نہ رہے ہوں۔ اس حلف میں بھی بنو ہاشم کی محصوری کی کوئی بات نہ تھی۔

۲۔ اس فیصلہ کو بعض اہم قرشی سرداروں، جن کے نام اوپر بیان ہو چکے ہیں، کی اشیرباد حاصل نہ تھی۔ وہ برابر اس کو ظلم و زیادتی قرار دے کر حلف اٹھانے والوں سے جھگڑتے رہے۔ بالآخر انھی کی کوششوں سے یہ محاذ آرائی ختم ہوئی۔

---

[1] صحیح مسلم۔ باب استحباب النزول بالمحصب یوم النحر۔ ج۱، ص۵۴۹۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ قریش کا متفقہ فیصلہ نہ تھا اسی لیے اس کی خلاف ورزی کے واقعات بھی روایتوں میں ملتے ہیں۔

۳۔ چونکہ محاصرہ نام کی کوئی چیز نہیں تھی اس لیے بنو ہاشم کے رشتہ دار ضرورت کی اشیا اپنے عزیزوں کو پہنچا سکتے تھے۔ چنانچہ حکیم بن حزام کے غلہ پہنچانے کا ذکر روایات میں ہوا ہے۔

۴۔ ابو ہریرہ کی روایت سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ بنو ہاشم کتنا عرصہ اس حلف کے باعث پریشان رہے۔لیکن یہ پریشانی یقیناً محصوری یا خوراک نہ ملنے کی نہیں تھی بلکہ وہ پریشانی تھی جو بعض ایسے لوگوں کی طرف سے معاشرتی مقاطعہ کے سبب سے ہوتی ہے جن کے ساتھ پہلے تعلقات درست رہے ہوں۔

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے قریش اور بنوکنانہ کے بطون میں لوگ ایمان لا چکے تھے۔ چونکہ یہ حلف صرف بنو ہاشم اور بنومطلب کے خلاف تھا لہذا باقی بطون کے مسلمان مثلاً ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما اور وہ تمام لوگ جن کے نام ان کے خانوادوں کے حوالہ سے اوپر بیان ہو چکے ہیں اس سے قطعاً متاثر نہیں ہوئے۔لہٰذا اس مقاطعہ نے دعوت دین کے معاملہ میں مسلمانوں کے لیے کوئی رخنہ نہیں ڈالا۔

علی ہذا القیاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا دوسرے لوگوں کے مسجد حرام میں آنے جانے یا شہر میں گھومنے پھرنے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت وتبلیغ کا کام حسب سابق جاری رہا۔اسی طرح حج وعمرہ کے حوالہ سے بنو ہاشم اپنی ذمہ داریاں ادا کر سکتے تھے۔

۵۔حلف میں شامل لوگوں کے سوا بنو ہاشم باقی لوگوں اور اہل مکہ سے مال لے سکتے تھے اور تجارتی لین دین کر سکتے تھے۔ان پر اس حلف کا اطلاق نہیں ہوتا تھا۔

۶۔روایتوں میں محصوری کا مقام شعب ابی طالب بتایا جاتا ہے جبکہ اس نام کی کوئی جگہ مکہ کے آس پاس ثابت نہیں ہے۔ اگر ہوسکتا ہے تو شعب بنی ہاشم مراد ہوسکتا ہے۔ یہ مکہ کا وہ محلّہ ہے جس میں بنو ہاشم کی بڑی تعداد مقیم تھی اور جو ماضی قریب تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جاے ولادت کے جنوب مغرب میں موجود رہا ہے۔حرم شریف کی توسیع کے پروگرام میں اس محلّہ اور اس پہاڑی کا، جس پر یہ آباد تھا، نام ونشان مٹ گیا ہے۔اس شعب کے بارے میں یہ تصور بالکل غلط ہے کہ یہ مکہ سے دور کوئی گھاٹی تھی جس میں بنو ہاشم قید ہو گئے تھے جبکہ خود روایات میں یہ بیان ہوا ہے کہ بچے جب بھوک سے روتے تو کفار ان کی آوازیں سن کر ہنستے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب گھاٹی مکہ کے دوسرے محلوں کے قریب ہی واقع ہو۔ اسی طرح یہ محلّہ بھی مکہ کے دوسرے علاقوں کی طرح بنجر تھا، اس میں

بیریوں کے باغ نہیں تھے جن کے پتوں پر بنو ہاشم اتنا عرصہ گزر اوقات کرتے رہے ہوں۔

اگر بنو ہاشم اپنے اس محلّہ میں اکٹھے ہوئے ہوں تو اس کی یہ شکل ممکن ہے کہ بعض لوگوں کے اس جذباتی حلف کے پیش نظر ابوطالب نے محلّہ سے باہر آباد بنو ہاشم کو یکجا ہو جانے کی ہدایت کی ہو تا کہ وہ لوگ کفار کی کسی زیادتی کا نشانہ نہ بننے پائیں۔ پھر جب قریش کے اچھے لوگوں نے شرارتی لوگوں کو لگام ڈال لی ہو تو بنو ہاشم دوبارہ اپنے مکانات میں منتقل ہو گئے ہوں۔ یہ بات ایک روایت میں بیان بھی ہوئی ہے[۲]۔

## دعوت مصالحت

قریش نے جب دیکھا کہ ان کی سخت گیری سے معاملہ بگڑ رہا ہے اور نیا دین معاشرہ میں جڑ پکڑ رہا ہے تو انھوں نے ایک سیاسی چال چلی۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ آپ لوگ ہمارے بھائی بند ہیں۔ ہمیں آپ کی مخالفت سے کوئی خوشی نہیں ہوتی۔ آپ کے ساتھ ہماری بڑی توقعات وابستہ تھیں کہ بنی ہاشم کی آپ قیادت کریں گے تو ہم سب کے وقار میں اضافہ ہوگا۔ اب بھی ہماری خواہش یہ ہے کہ آپ اپنی تعلیم کے ان حصوں میں، جو ہمارے لیے وحشت کا باعث بنتے ہیں، ترمیم کر کے ان کو ہم لوگوں کے لیے قابل قبول بنا دیں، نیز ہماری بعض عادات چونکہ نہایت پختہ ہو چکی ہیں جس کے باعث آپ کے بتائے ہوئے احکام کی موجودہ شکل میں لوگوں کے لیے ان پر عمل کرنا مشکل محسوس ہوتا ہے لہٰذا ان میں ذرا سا ردوبدل کر دیں تو پھر ہمارے لیے آپ کی باتوں کو ماننا ممکن ہو جائے گا۔ ہمارے عوام بھی آپ کے دین کو اختیار کر لیں گے۔ اس طرح آپ کی کامیابی کی منزل قریب آ جائے گی۔

اس طرح کی تجویز آدمی کو غور کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ وہ اس کے امکانات کا جائزہ لینے پر تیار ہو جاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اگر میں وقتی طور پر ان لوگوں کو کچھ رعایت دے دوں تو شاید کچھ عرصہ بعد یہ لوگ حقیقی دین کے رمز شناس ہو کر پورے دین پر عمل کرنے لگیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قوم سے محبت تھی، آپ اس کے ایمان کے حریص تھے اور چاہتے تھے کہ یہ لوگ اپنی نادانی میں جہنم کا ایندھن نہ بن جائیں۔ لہٰذا آپ اس تجویز کے بارے میں سوچنے لگے۔ پیغمبر چونکہ زمین پر اللہ تعالیٰ کے نمائندہ کی حیثیت سے کام کر رہا ہوتا ہے اس لیے وہ اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں ہوتا ہے۔ اس طرح کے مواقع میں جہاں پیغمبر مذبذب ہو کر خود کوئی فیصلہ نہ کر پا رہا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو غلط اقدام سے روک کر

---

۲۔ سیرۃ النبیؐ۔ ابن کثیر۔ ج ۱، ص ۳۴۴۔

صحیح سمت میں اس کی رہنمائی کر دیتا ہے۔ یہی صورت حال یہاں پیش آئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تذبذب کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

وَ اِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ وَ اِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا. وَلَوْ لَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا. اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَ ضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا. (بنی اسرائیل ۱۷: ۷۳۔۷۵)

’’اور بے شک قریب تھا کہ وہ تم کو فتنوں میں ڈال کر اس چیز سے ہٹا دیں جو ہم نے تم پر وحی کی ہے تاکہ تم اس سے مختلف ہم پر افترا کر کے پیش کرو، اور تب وہ تم کو اپنا گاڑھا دوست بنا لیتے اور اگر ہم نے تم کو جمائے نہ رکھا ہوتا تو قریب تھا کہ تم ان کی طرف کچھ جھک پڑو۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم تم کو زندگی اور موت دونوں کا دوگنا عذاب چکھاتے، پھر تم ہمارے مقابل میں اپنا کوئی مددگار نہ پاتے۔‘‘

دوسرے مقام پر قرآن میں یوں بیان ہوا ہے:

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ. قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ. قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ. اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ. (یونس ۱۰: ۱۵۔۱۶)

’’اور جب ہماری کھلی ہوئی آیتیں ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہماری ملاقات کے متوقع نہیں ہیں، کہتے ہیں: اس قرآن کے سوا کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں ترمیم کر دو۔ کہہ دو: مجھے کیا حق ہے کہ میں اپنے جی سے اس میں ترمیم کر دوں۔ میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر آتی ہے۔ اگر میں نے اپنے رب کی نافرمانی کی تو ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ کہہ دو اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو نہ میں اس کو تمھیں سناتا اور نہ وہ اس سے تمھیں باخبر کرتا۔ میں اس سے پہلے تم میں ایک عمر بسر کر چکا ہوں۔ تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟‘‘

یعنی کتاب میری اپنی تصنیف نہیں کہ میں اپنی مرضی سے اس کے مضامین میں تغیر و تبدل کر دوں۔ یہ خدا کا کلام ہے جس کی پیروی پر میں مامور ہوں۔ میں اس کی کسی بات کو منسوخ نہیں کر سکتا۔ اگر میں ایسا کروں تو میں خدا کی پکڑ

میں آ جاؤں گا۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا. اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَ اَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا. (الجن۷۲:۲۶-۲۸)

''غیب کا جاننے والا وہی (خدا) ہے اور وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا۔ رہے وہ جن کو وہ رسول کی حیثیت سے انتخاب فرماتا ہے تو وہ ان کے آگے اور پیچھے پہرہ رکھتا ہے کہ دیکھے کہ انھوں نے رب کے پیغام پہنچا دیے۔ اور وہ ان کے گردوپیش کا احاطہ کیے اور ہر چیز کو شمار میں رکھے ہوتا ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ جب غیب کی باتیں وحی کی صورت میں اپنے رسول کے حوالہ کرتا ہے تو پھر رسول کو آزاد نہیں چھوڑ دیتا کہ اب وہ اپنی مرضی سے لوگوں کے ساتھ جو معاملہ چاہے کر لے۔ بلکہ رسول کو سخت نگرانی میں رکھتا ہے۔ اس کے اردگرد فرشتوں کا پہرہ لگا دیتا ہے تاکہ اس کا پیغام صحیح شکل میں رسول کی قوم تک پہنچ جائے۔ لہٰذا اس بات کا کوئی امکان نہیں ہوتا کہ پیغمبر اپنے طور پر یا دوسروں کے کہنے پر کلام خداوندی میں کوئی تغیر و تبدل کر سکے۔ اس مضمون کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ. وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ. لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ. ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ. فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ. وَ اِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ. (الحاقہ ۶۹:۴۳-۴۸)

''یہ (قرآن) خداوند عالم کی طرف سے اتارا ہوا ہے۔ اور اگر یہ (پیغمبر) ہم پر کوئی بات گھڑ کر لگاتا تو ہم اس کو قوی بازو سے پکڑتے، پھر ہم اس کی شاہ رگ ہی کاٹ دیتے۔ پس تم میں سے کوئی بھی اس سے ہم کو روکنے والا نہ بن سکتا۔ اور یہ تو خدا سے ڈرنے والوں کے لیے ایک یاددہانی ہے۔''

یہاں قریش کو بتایا ہے کہ جس شخص کو رسول منتخب کیا جاتا ہے اس سے اس بات کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا کہ وہ وحی خداوندی میں اپنی جانب سے جھوٹ کی ملاوٹ کر دے۔ اگر کوئی رسول ایسا کرنے کی جسارت کرے تو اس خیانت پر اسی لمحے اس کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رہنمائی دی کہ نازل شدہ وحی کو بے کم وکاست لوگوں تک پہنچانا تمھاری ذمہ داری ہے۔ یہ لوگ تو چاہتے ہیں کہ تم اگر نرمی اختیار کرو تو یہ بھی اپنی مخالفت میں نرمی پیدا کر لیں گے، لیکن تم اس

تعلیم میں تبدیلی کرنے کے مجاز نہیں ہو۔تم خدا کے آگے مسئول ہو، ان لوگوں کے آگے مسئول نہیں ہو۔لہٰذا مخالفین خواہ کتنا ہی زور لگائیں وہ اللہ کی آیات سے تمھیں روکنے نہ پائیں۔ یہ جن باتوں سے چڑتے ہیں ان کو برملا اور ڈنکے کی چوٹ کہو۔خدا کی اتاری ہوئی بات نہ واپس ہوسکتی ہے اور نہ دبائی جا سکتی ہے۔ یہاں سے ایک سیاسی لیڈر اور ایک پیغمبر کا فرق واضح ہوتا ہے۔پیغمبر اپنے موقف میں تبدیلی نہیں لا سکتا لیکن سیاسی لیڈر وقتی مصالح کے تحت فیصلے کرتا ہے اور اس طرح کے مواقع سے فائدہ اٹھاتا ہے جس طرح کے مواقع قریش نے پیدا کیے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مراعات دینے کا فیصلہ کیا۔

مذکورہ دعوت مصالحت ہی کے سلسلہ میں قریش کا ایک وفد ابوطالب سے بھی ملا۔انھوں نے ان سے درخواست کی کہ اپنے بھتیجے کو قائل کریں کہ وہ اپنی دعوت میں ترمیم کرے اور اس کے بدلے میں وہ جو دولت، عزت، شرف اور سیادت قوم سے حاصل کرنا چاہتا ہے ہم وہ اس کے قدموں میں ڈالنے کو تیار ہیں۔ ابوطالب نے حضورؐ کو بلایا اور قریش کی تجویز آپ کے سامنے رکھی۔اس پر آپ نے مشہور و معروف جملہ کہا کہ چچا جان، اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی لا کر رکھ دیں کہ میں اس دعوت سے دستبردار ہو جاؤں تو یہ چیز مجھے قبول نہیں۔اس پر ابوطالب نے کہا کہ اچھا تم اپنا کام کیے جاؤ۔

مخالفین جب سمجھوتے کی کسی تجویز کے بروئے کار آنے سے مایوس ہو گئے تو انھوں نے دہشت گردی کا بازار پھر سے گرم کر دیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں پر سختیاں پھر سے شروع کر دیں۔

## حضرت ابوبکر کا ارادۂ ہجرت

حضرت ابوبکر صدیق قریش میں نہایت معزز سمجھے جاتے تھے اور مکہ کی ریاست میں دیت اور تاوانوں کے معاملات طے کرنا ان کی ذمہ داری تھی۔اس کے باوجود قریش کی نگاہوں میں ان کا اسلام لانے کا جرم بری طرح کھٹکتا تھا۔وہ صاحب عزیمت آدمی تھے اور غریب مسلمانوں کی پشت پناہی سے کبھی گریز نہیں کرتے تھے۔سنگین سے سنگین حالات میں ان کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آئی۔لیکن اب قریش اتنے وحشی ہو رہے تھے کہ حضرت ابوبکر جیسے عزم کے پہاڑ نے بھی سوچا کہ مکہ سے ہجرت کر جائیں اور حبشہ میں دوسرے مسلمانوں سے جا ملیں۔مکہ سے نکل کر کئی میل کا فاصلہ طے کر چکے تھے کہ ایک دوست ابن الدغنہ، جو قارہ قبیلہ کا سردار تھا، سے ملاقات ہوگئی۔اس نے پوچھا، ابوبکر کہاں جانے کا ارادہ ہے تو انھوں نے جواب دیا کہ میری قوم نے مجھے مکہ سے نکلنے پر مجبور کر دیا ہے۔اب

میں چاہتا ہوں کہ زمین میں چل پھر کر خدا کی عبادت کروں۔ ابن الدغنہ نے کہا کہ میں تمھیں اپنی پناہ میں لیتا ہوں، واپس چلو۔ یہ واپس آ گئے تو ابن الدغنہ نے قریش کے تمام خانوادوں کے سرداروں سے ملاقاتیں کیں اور اپنی پناہ کے حوالے سے کہا کہ ابوبکر جیسا شخص نہ مکہ سے نکل سکتا اور نہ نکالا جا سکتا ہے۔ کیا تم ایک ایسے شخص کو نکالو گے جو غریبوں کی اعانت کرتا ہے، صلہ رحمی کرتا ہے، لوگوں کا بار اٹھاتا ہے، مہمان نوازی کرتا ہے اور لوگوں کی مشکلات میں ان کا سہارا بنتا ہے۔ قریش نے ابن الدغنہ کی پناہ کو تسلیم کر لیا اور حضرت ابوبکر کو اجازت دے دی کہ اپنے گھر میں اللہ کی عبادت کریں، نماز پڑھیں اور قرآن کی قرأت کریں مگر اس کا اعلان نہ کریں کیونکہ ہمیں ڈر ہے کہ اس طرح وہ ہمارے بچوں اور عورتوں کو بہکا دیں گے۔ حضرت ابوبکر نے گھر کے سامنے صحن چھوڑا ہوا تھا۔ انھوں نے اس میں جاے نماز بنا لی۔ وہاں نماز پڑھتے اور قرأت کرتے۔ جب قرآن پڑھتے تو اپنے آنسوؤں پر قابو نہ پا سکتے۔ مکان کے پاس سے گزرنے والے لوگ تعجب سے ان کو دیکھتے اور متاثر ہوتے۔ اس چیز نے مشرکین کو گھبرا دیا۔ انھوں نے ابن الدغنہ سے کہا کہ ابوبکر کو کنٹرول کریں۔ ابن الدغنہ نے ابوبکر سے کہا کہ گھر کے اندر عبادت کیا کریں۔ اگر علانیہ ایسا کرنا ہے تو میرا ذمہ خود ہی لوٹا دیں۔ کیونکہ میں یہ پسند نہیں کرتا کہ اہل عرب یہ کہیں کہ اس شخص نے ایک آدمی کو پناہ دی، پھر خود ہی اپنی امان کو توڑ دیا۔ حضرت ابوبکر جیسا آدمی اس طرح کی پناہ گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے کہہ دیا کہ میں آپ کی پناہ آپ کو واپس کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کی پناہ پر راضی ہوں۔ اس کے بعد انھوں نے کفار کی زیادتیوں کا خود ہی مقابلہ کرنے کی ٹھانی اور حبشہ کو ہجرت کا خیال دل سے نکال دیا[۳]۔ یوں اللہ تعالیٰ نے کمزور مسلمانوں کے ایک ہمدرد اور خیر خواہ کو ان کی سرپرستی کے لیے مکہ ہی میں رکھا۔ ان کے قیام کا دوسرا فائدہ یہ تھا کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معتمد ترین دوست تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام اہم امور میں ان کے مشورہ سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ مشورہ کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر ہی کے ہمراہ ہجرت فرمائی۔

---

۳؎ صحیح بخاری۔ کتاب الکفالہ۔ باب جوار ابی بکر فی عہد النبیؐ وعقدہٖ۔ ج ۳، ص ۱۲۶۔ دار احیاء التراث العربی۔

سیرت صحابہ
محمد وسیم اختر مفتی

# عثمان غنی رضی اللہ عنہ

## گذشتہ سے پیوستہ

## (۲)

[''سیر وسوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

خلیفۂ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ تندرست تھے کہ کچھ اہل ایمان نے انھیں اپنا جانشین مقرر کرنے کا مشورہ دیا۔ وہ سوچ میں پڑ گئے اور کہا: اگر میں اپنا جانشین خود مقرر کروں تو روا ہو گا، کیونکہ مجھ سے بہتر شخص (ابوبکر رضی اللہ عنہ) نے ایسا کیا ہے اور اگر ایسا نہیں کرتا تو بھی جائز ہے کیونکہ مجھ سے کہیں زیادہ صاحب فضیلت شخصیت (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایسا کیا ہے۔ کچھ غور وفکر کے بعد انھیں اندیشہ ہوا اگر اس بارے میں اہل ایمان کی راہ نمائی نہ کی گئی تو وہ نزاع میں مبتلا ہو جائیں گے۔ قاتلانہ حملے میں شدید زخمی ہونے کے بعد بھی انھوں نے کسی فرد کو نامزد کرنے کے بجاے عشرۂ مبشرہ میں سے ۶ زندہ اصحاب رسول حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت زبیر بن عوام، حضرت طلحہ بن عبید اللہ، حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت عبدالرحمان بن عوف کی مجلس بنانا پسند کیا اور ساتویں صاحب بشارت سعید بن زید کو اپنا چچا زاد ہونے کی وجہ سے شامل نہ کیا۔ حضرت عمر نے ان صحابیوں کو ترجیح دینے کی وجہ خود ہی بیان کر دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے رخصت ہوتے وقت ان سے راضی تھے۔ ان میں سے کسی ایک کو مامور کرنا ان کے لیے مشکل ہو گیا یا شاید وہ خیال کر رہے تھے کہ اہل راے کے باہمی مشورہ سے خلیفہ کا انتخاب زیادہ موزوں ہو گا۔ انھوں نے اپنے بیٹے عبداللہ کو وصیت کی، انتخاب کے وقت موجود رہیں تاہم ان کا اس میں کوئی دخل نہ ہو گا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا عباس بن عبدالمطلب بہت تاخیر سے اس وقت ایمان لائے تھے جب آپ نے فتح

کے لیے کوچ کیا۔ رخصت ہونے کے بعد وہ بنو ہاشم کو خلافت دلانے کے لیے سر گرم رہے۔ اوائل محرم ۲۴ھ میں بھی جب خلیفۂ ثالث کا انتخاب ہونے لگا تو انھوں نے حضرت علی کو مشورہ دیا کہ ۶ اصحاب کی مجلس انتخاب میں وہ شامل نہ ہوں۔ حضرت علی نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں اختلاف پسند نہیں کرتا۔ ادھر بنو امیہ یہ منصب حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مقررہ مجلس شوریٰ کا اجلاس شروع ہوا، عمر رضی اللہ عنہ کی وصیت کے مطابق ابوطلحہ انصاری اپنے ۵۰ ساتھیوں کو لے کر پہرے پر کھڑے تھے۔ پہلے دو دن ارکان شوریٰ کوئی فیصلہ نہ کر پائے تو ابوطلحہ نے انھیں تنبیہ کی کہ وہ ان کو تین دن سے زیادہ مہلت نہ دیں گے۔ اس مرحلے پر عبدالرحمان بن عوف نے یہ مسئلہ سلجھانے کی کوشش کی۔ انھیں معلوم تھا کہ علی و عثمان ہی خلافت کے دو بنیادی حق دار ہیں۔ وہ ان دونوں سے الگ الگ ملے، حضرت علی سے پوچھا، آپ سبقت الی الاسلام کی وجہ سے خلافت کے اہل ہیں لیکن اگر آپ کو خلافت نہ ملی تو آپ کے خیال میں یہ ذمہ داری کسے اٹھانی چاہیے؟ انھوں نے جواب دیا عثمان کو، پھر یہی بات حضرت عثمان سے پوچھی تو انھوں نے حضرت علی کا نام لیا۔ اب عبدالرحمان نے چاہا، انتخاب ان دونوں پر موقوف ہو جائے۔ انھوں نے اصحاب شوریٰ سے مطالبہ کیا کہ ان میں سے تین ان تینوں کے حق میں دست بردار ہو جائیں جنھیں وہ خلافت کا زیادہ حق دار سمجھتے ہیں۔ چنانچہ زبیر علی کے حق میں، سعد عبدالرحمان کے اور طلحہ عثمان کے حق میں دست بردار ہو گئے۔ عبدالرحمان اپنے امیدوار نہ ہونے کا اعلان پہلے ہی کر چکے تھے، اس لیے معاملۂ انتخاب علی و عثمان کے بیچ معلق ہو گیا۔ عبدالرحمان کے پاس اپنے ووٹ کے علاوہ سعد کا حق رائے دہی بھی آ چکا تھا۔ وہ اپنا فیصلہ فوراً صادر کر سکتے تھے تاہم انھوں نے مدینے میں موجود اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم، عمائدین، عوام الناس حتیٰ کہ عورتوں اور بچوں سے مشورہ کرنا ضروری سمجھا۔ ان سب کی اکثریت نے عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں رائے دی۔

مورخین نے عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں زیادہ آرا آنے کی مختلف وجوہات بیان کی ہیں۔ لوگ عمر رضی اللہ عنہ کی سختی اور مال سے بے رغبتی دیکھ چکے تھے۔ علی رضی اللہ عنہ بھی انھیں بے نیاز نظر آتے تھے اس لیے انھوں نے عثمان رضی اللہ عنہ کو ترجیح دی۔ بنو امیہ تعداد میں بنو ہاشم سے زیادہ تھے اس لیے انھیں عددی برتری حاصل ہو گئی۔ حضرت عثمان کی عمر ۷۰ برس سے تجاوز کر چکی تھی جب کہ حضرت علی ۶۰ سال سے بھی کم تھے اس لیے مسلمانوں نے انھیں زیادہ معتبر جانا۔ انھیں توقع تھی کہ عمر کے تفاوت کی وجہ سے عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد علی رضی اللہ عنہ کے خلیفہ بننے کا بہت امکان ہو گا۔ تین دنوں کی مہلت کی آخری رات گزرنے والی تھی کہ عبدالرحمان اپنے بھانجے مسور بن مخرمہ کے گھر پہنچے۔ علی و عثمان کو وہاں بلایا اور انھیں بتایا کہ اہل ایمان آپ دونوں میں سے ایک کو خلیفہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ انھوں

نے ان دونوں سے عہد لیا، جسے وہ خلیفہ مقرر کریں گے، عدل وانصاف سے کام لے گا اور جسے یہ ذمہ داری نہ مل پائی، سمع واطاعت کرے گا۔ فجر کے وقت منادی ہوئی کہ لوگ مسجد نبوی میں جمع ہو جائیں۔ عوام الناس کے ساتھ انصار و مہاجرین کے زعما اور فوجی کمانڈر موجود تھے۔ نماز کے بعد عبدالرحمان منبر پر چڑھے، انھوں نے وہ عمامہ پہن رکھا تھا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے ان کے سر پر باندھا تھا۔ ان کی دعا طویل ہوگئی تو سعد بن ابی وقاص پکارے، جلد انتخاب خلیفہ کا اعلان کر دیجیے، مبادا لوگ کسی فتنے میں مبتلا ہو جائیں۔ عبدالرحمان بن عوف نے علی کا ہاتھ تھاما اور پوچھا، کیا وہ کتاب اللہ، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سیرت شیخین ابوبکر وعمر پر عمل کریں گے؟ ان کے اقرار کے بعد کہ وہ اپنے علم کے مطابق مقدور بھر ایسا ہی کریں گے انھوں نے حضرت عثمان سے بھی یہی عہد لیا۔ وہ عثمان کا ہاتھ تھامے رہے، سر آسمان کی طرف بلند کیا اور تین بار کہا، اے اللہ! سن لے اور گواہ رہ۔ میں نے خلافت کی ذمہ داری عثمان کو سونپ دی۔ عبدالرحمان کے بعد ان کے پاس کھڑے علی نے عثمان کے ہاتھ پر بیعت کی پھر مسجد میں موجود سب اہل ایمان بیعت کے لیے ٹوٹ پڑے۔ (ابن سعد) ایک روایت کے مطابق حضرت علی نے تاخیر کی اور عبدالرحمان کے پکارنے پر بیعت کے لیے لوٹے۔ (طبری)

بیعت مکمل ہونے کے بعد حضرت عثمان نے منبر پر کھڑے ہو کر حاضرین سے خطاب کیا، لوگو! دنیا دھوکے کا سامان ہے تمھیں شیطان مغرور اللہ کے بارے میں دھوکے میں مبتلا نہ کرنے پائے۔ آخرت طلب کرو، ''باقی رہنے والی نیکیاں ہی تمہارے رب کے ہاں اجر وثواب پانے اور امیدیں قائم کرنے کے لیے بہترین ہیں۔''

خلیفۂ سوم کو پہلا قضیہ عبیداللہ بن عمر کا پیش آیا جنھوں نے جوش غضب میں ہرمزان، جفینہ اور ابولؤلؤہ فیروز کی چھوٹی بچی لؤلؤہ کو قتل کر ڈالا تھا۔ وہ دو مسلمانوں اور ایک ذمی کے قتل کا قصاص ان سے لینا چاہتے تھے۔ حضرت علی نے ان کی تائید کی لیکن باقی مسلمانوں نے کہا، کل عمر رضی اللہ عنہ شہید ہوئے، آج ان کے بیٹے کو قتل کر دیا جائے؟ عمرو بن عاص نے رائے ظاہر کی، یہ قتل خلیفۂ ثالث کے عہدہ سنبھالنے سے پہلے ہو چکے تھے اس لیے ان پر کوئی ذمہ داری نہیں۔ حضرت عثمان یہ مشورہ نہ مانے اور ہرمزان کے بیٹے سے قصاص لینے کو کہا۔ اس نے معاف کر دیا، جفینہ اور ابولؤلؤہ کی بیٹی کی دیت انھوں نے اپنی جیب سے ادا کر دی۔ زیاد بن لبید نے عثمان رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے کی مذمت میں اشعار کہے تو وہ خود اس کے پاس گئے اور اسے مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنے سے روکا۔

لوگوں کے وظائف بڑھانا خلیفۂ سوم کا پہلا فیصلہ تھا۔ بقیہ عطیات برقرار رکھتے ہوئے انھوں نے ہر فوجی کے وظیفے میں ۱۰۰ درہم کا اضافہ کیا۔ انھوں نے عبادت گزاروں، اعتکاف کرنے والوں، مسافروں اور مسکینوں کے لیے

مسجد نبوی میں دستر خوان لگوا دیے۔ حضرت عمر کے مقرر کردہ گورنران کی وصیت کے مطابق برقرار رکھے گئے۔ ۲۴ھ خلافت عثمانی کا پہلا سال تھا۔ اس سال کئی لوگوں کی نکسیر پھوٹی حتیٰ کہ اسے نکسیر والا سال (سنة الرعاف) کہا جانے لگا۔ حضرت عثمان نکسیر پھوٹنے کی وجہ سے حج پر نہ جا سکے۔ ان کی جگہ عبدالرحمان بن عوف امیر حج بنے۔

بحر قزوین کے کنارے واقع شہر آذر بیجان، اس کی بندرگاہ در بند شروان (باب الابواب) اور موقان عہد فاروقی کی آخری فتوحات تھیں۔ یہ علاقے مسلمانوں کے کنٹرول میں آ گئے تو کمانڈر عبدالرحمان بن ربیعہ نے پڑوس کے ترکوں کی جانب پیش قدمی شروع کی۔ ترک پہاڑوں میں پناہ لے چکے تھے اور عبدالرحمان راستے میں تھے کہ حضرت عمر کی شہادت کی خبر آ گئی۔ انھوں نے وہیں رک کر نو منتخب خلیفہ حضرت عثمان کے حکم کا انتظار کرنا مناسب سمجھا۔ عہد عثمانی میں ان کی مہم تو سر نہ ہوئی البتہ جب اہل آذر بیجان نے ۲۴ھ میں معاہدۂ صلح سے روگردانی کر کے جزیہ دینے سے انکار کیا تو ولید بن عقبہ نے ان کی سرکوبی کی۔ ولید نے عبداللہ بن شبیل کی قیادت میں ایک لشکر آذر بیجان کے پڑوسی شہروں موقان، ببر اور طیلسان کی طرف بھی بھیجا۔ یہ علاقے پھر سے زیر نگیں ہو گئے تو انھوں نے سلمان بن ربیعہ باہلی کو ارمینیہ روانہ کیا۔ یہ شہر حضرت عمر کے دور خلافت میں حضرت خالد بن ولید کے ہاتھوں فتح ہوا تھا اور اب آمادۂ بغاوت تھا۔ بلاذری کے خیال میں سلمان کے بجائے حبیب بن فہری ۶ ہزار کا لشکر لے کر اس مہم پر گئے۔ محمد حسین ہیکل نے ان دونوں روایتوں میں یوں موافقت پیدا کی ہے، سلمان نے اس شہر کے ایرانی حصے کو جب کہ حبیب نے رومی جانب کو زیر کیا۔ ان سرگرمیوں سے فارغ ہو کر ولید بن عقبہ موصل پہنچے۔ انھیں سیدنا عثمان کا خط موصول ہوا، مجھے معاویہ بن ابوسفیان کے ذریعے معلوم ہوا ہے کہ رومی شام میں موجود مسلمانوں پر حملے کی تیاری کر رہے ہیں۔ یہ خط موصول ہوتے ہی ۸ سے ۱۰ ہزار تک کا لشکر وہاں بھیج دو۔ سلمان بن ربیعہ باہلی کی کمان میں یہ جیش شام پہنچا اور وہاں موجود حبیب بن مسلمہ کی فوج سے جا ملا۔ رومیوں کا خیال تھا، حضرت عمر کی شہادت سے مسلمانوں کا دبدبہ جاتا رہا ہے۔ جب انھوں نے منہ کی کھائی تو آس پاس کے علاقوں پر بھی مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی۔

شام کے محاذ میں پٹنے کے بعد رومیوں کی توجہ مصر کی طرف مرکوز ہوئی۔ انھیں اپنی بحریہ پر اعتماد تھا، وہ جانتے تھے کہ خلافت اسلامیہ کے پاس کوئی بحری طاقت نہیں ہے۔ عہد فاروقی میں معاویہ نے بحری بیڑے کی تیاری پر اصرار کیا تو حضرت عمر نے عمرو بن عاص سے مشورہ کیا، انھوں نے سمندر کی ہولناکیوں کا ایسا نقشہ کھینچا کہ سمندری فورس بنانے کی اجازت نہ ملی۔ عمرو نے اہل مصر کو اپنے عقائد پر چلنے کی آزادی دے رکھی تھی۔ انھوں نے عوام پر ٹیکسوں کا بوجھ نہ

لاد ااور اہم مناصب پر مقامی افراد اور مصر رہ جانے والے رومیوں کو فائز کیا۔ان پالیسیوں سے عام مصری خوش تھے جب کہ باشندگان اسکندریہ ناراض ہو گئے کیونکہ انھیں حاصل امتیازات جاتے رہے تھے۔عمرو کو اس ردعمل کی خبر نہ تھی،انھوں نے اسکندریہ کے محفوظ قلعے مسمار نہ کیے جیسا کہ بعض مصری شہروں میں وہ کر چکے تھے۔ وہاں موجود مسلمان فوجیوں کی نفری بھی ۱ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ان حالات میں اسکندریہ میں موجود رومیوں نے دارالسلطنت قسطنطنیہ میں مقیم شکست خوردہ بازنطینی قیادت سے رابطہ استوار کیا۔ ہرقل کے پوتے شاہ کانسٹنز دوم (Constantine ii) کو معلوم ہوا کہ اس وقت اسکندریہ کی چھاؤنی کم زور ہے تو اس نے اس شہر پر سمندر کی جانب سے اچانک حملے کا پروگرام بنا لیا۔مصر کے معزول حکم ران مقوقس کا اس میں کوئی دخل نہ تھا۔۲۵ھ (۶۴۵ء) میں جب حضرت عثمان کو خلافت سنبھالے سوا سال ہوا تھا،رومی کمانڈر مینویل (Manuel) کی سربراہی میں ۳۰۰ سمندری جہازوں کا بیڑا ایک بڑی فوج کو لے کر چلا۔بڑی راز داری سے اس نے اپنا سفر طے کیا اور اسکندریہ اتر کر اس پر قبضہ کر لیا۔زیادہ تر مسلمان سپاہی شہید ہو گئے کچھ نے بھاگ کر جان بچائی۔رومیوں نے زیریں مصر میں بھی غارت گری اور لوٹ مار کی۔

عمرو بن عاص ہی وہ شخص تھے جو اس حملے کا دفاع کر سکتے تھے۔حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اہل راے کے مشورہ سے انھیں ہی مصر سے رومیوں کو نکال پھینکنے کی ذمہ داری سونپی۔ بابلیون کے کمانڈر خارجہ بن حذافہ نے مشورہ دیا کہ اسکندریہ پہنچ کر رومی فوج کو روکا جائے لیکن عمرو نے بابلیون میں رہ کر غنیم کے آنے کا انتظار کیا اور اسی دوران میں اپنی فوج منظّم کر لی۔رومی نقیوس پہنچے تو وہ ۱۵ ہزار کا لشکر لے کر ان کا مقابلہ کرنے نکلے۔قلعۂ بابلیون کے باہر دریا کنارے بڑے زور کا معرکہ ہوا۔عمرو اپنا گھوڑا لے کر اگلی صفوں میں گھس گئے کئی رومیوں کو جہنم واصل کرنے کے بعد ان کا گھوڑا زخمی ہو گیا تو وہ پیادہ لڑنے لگے۔انھیں دیکھ کر ان کے سپاہیوں میں بھی جوش کی لہر دوڑ گئی۔ایک مسلمان حومل نے اپنی شجاعت کا خوب مظاہرہ کیا اس نے سخت دوبدو جنگ کے بعد دعوت مبارزت دینے والے رومی کو قتل کیا اور خود بھی شدید زخمی ہوا۔انجام کار رومیوں کو شکست ہوئی اور وہ واپس اسکندریہ کو دوڑے،انھوں نے جاتے جاتے تمام پل توڑے اور بستیاں اجاڑ دیں۔رومی مظالم سے تنگ آئے ہوئے قبطیوں نے ان پلوں کو جوڑنے میں جیش اسلامی کی مدد کی۔عمرو بن عاص رومی بھگوڑوں کا پیچھا کرتے ہوئے اسکندریہ پہنچے تو وہ قلعہ بند ہو گئے۔انھوں نے منجنیقوں سے پتھر برسانے شروع کیے تو عمرو کو احساس ہوا کہ انھوں نے اسکندریہ کے قلعے برقرار رکھ کر بڑی غلطی کی۔انھوں نے شہر کے مشرقی جانب فوج اتار کر رومی فوج کے باہر نکلنے کے راستے مسدود کر دیے۔تاریخ میں اس

محاصرے کی کوئی تفصیل نہیں ملتی یہ کتنا عرصہ جاری رہا اور فتح کے کیا اسباب میسر آئے؟ بس اتنا معلوم ہے کہ قلعوں پر قبضہ ہوا تو زیادہ تر رومی مارے گئے، اسلامی فوج اسکندریہ کے وسط میں پہنچی تو کوئی فرد بھی مقابلہ کرنے والا نہ تھا۔ ان کی بہت قلیل تعداد فرار ہو کر سمندر میں لنگر انداز اپنے بحری جہازوں تک پہنچنے میں کامیاب ہوئی۔ عمرو بن عاص نے جس جگہ جنگ سے ہاتھ روکنے کا حکم دیا، بعد میں وہاں مسجد رحمت تعمیر کی گئی۔ رومیوں کے چلے جانے کے بعد مصر کے مقامی باشندے عمرو کے پاس آئے اور کہا، رومیوں نے ہمارے سب مال مویشی لوٹ لیے ہیں۔ انھوں نے حاصل شدہ مال غنیمت ان کے سامنے رکھ دیا اور ثبوت پیش کرنے پر اصل مالک کو اس کی شے لوٹا دی۔

۲۴ھ میں حضرت عثمان نے مغیرہ بن شعبہ کو ہٹا کر سعد بن ابی وقاص کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا۔ انھوں نے عمال اور امرا کو خطوط لکھے کہ وہ اپنی رعایا اور اپنے سپاہیوں سے حسن سلوک کریں اور ان کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی نہ کریں۔ ۲۶ھ میں انھوں نے مسجد حرام میں توسیع کی۔ اسی برس جب کہ سعد بن ابی وقاص کو کوفہ کا دوبارہ عامل بنے سوا سال ہو چکا تھا کہ عبداللہ بن مسعود سے ان کا جھگڑا ہو گیا۔ انھوں نے عبداللہ سے کچھ قرض لے رکھا جو وہ مقررہ مدت میں واپس نہ کر پائے۔ حضرت عثمان کو یہ خبر ملی تو وہ ناراض ہوئے اور سعد کو معزول کر کے ولید بن عقبہ کو گورنر بنا دیا۔

حضرت عمر نے اپنے عہد خلافت میں طرابلس (Tripoli) کی فتح کے بعد عمرو بن عاص کو افریقہ میں پیش قدمی سے روک دیا تھا۔ دور عثمانی میں جب رومیوں کو مصر سے دوسری بار نکال باہر کیا گیا تو عبداللہ بن سعد بن ابی سرح نے حضرت عثمان سے افریقہ پر حملہ کرنے کی اجازت مانگی۔ ۲۷ھ (۶۴۸ء) میں انھیں اجازت ملی تو وہ ۲۰ ہزار کا لشکر لے کر افریقہ روانہ ہوئے۔ اس وقت تیونس سے مراکش تک کا سارا علاقہ رومی تسلط میں تھا۔ رومی بادشاہ کانسٹنز دوم (Constantine II) کی طرف سے گریگوری (Gregory) کو یہاں کا گورنر مقرر کیا گیا تھا لیکن اس نے اس وقت عیسائی فرقوں میں جاری نظریاتی کشمکش کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بغاوت کر دی اور خود بادشاہ بن گیا۔ ابن ابی سرح کو روکنے کے لیے وہ اپنی ۲ لاکھ پر مشتمل فوج لے کر دار الحکومت سبیطلہ (Sufetula) سے نکلا۔ کئی روز دونوں فوجیں آمنے سامنے رہیں، چند جھڑپوں کے سوا جنگ کی نوبت نہ آئی۔ اسی اثنا میں عبداللہ بن زبیر کی کمان میں حضرت عثمان کی بھیجی ہوئی کمک آن پہنچی، عبداللہ بن عمر، عبیداللہ بن عمر، عبدالرحمان بن ابوبکر اور عبداللہ بن عمرو جیسے صحابہ اس میں شامل تھے۔ ابن زبیر نے ابن ابی سرح کو غائب پایا۔ انھیں معلوم ہوا کہ گریگوری (Gregory) نے ان کے سر کی قیمت ۱ لاکھ دینار مقرر کر رکھی ہے اور ان کے قاتل سے اپنی بیٹی بیاہنے کا اعلان کیا ہے تو مشورہ دیا کہ ایسا

ہی اعلان عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کی طرف سے بھی کر دیا جائے اور گریگوری کے قاتل کو یہاں کا گورنر بنانے کی پیش کش کی جائے۔ جنگ شروع ہوئی، کئی روز تک نتیجہ نہ نکلا۔ ایک دن عبداللہ ابن زبیر نے اسلامی فوج کے ایک حصے کو خیموں میں آرام کرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ دوپہر کے بعد لڑائی بند ہوئی، رومی سپاہی فارغ ہو کر غافل ہوئے ہی تھے کہ ابن زبیر اپنے تازہ دم دستوں کے ساتھ ان پر ٹوٹ پڑے۔ اس اچانک حملے سے وہ سنبھل نہ سکے اور گاجر مولی کی طرح کاٹے جانے لگے۔ میدان جنگ ان کی لاشوں سے پٹ گیا۔ عبداللہ بن زبیر نے رومی صفوں میں گھس کر گریگوری کو جہنم واصل کیا۔ اس کی بیٹی اسیر ہوئی اور اعلان کے مطابق انھیں کے حصہ میں آئی۔ دوسری روایت کے مطابق وہ ایک انصاری کو ملی۔ (ابن اثیر) اب اسلامی فوج کے کمانڈر ابن ابی سرح نے سبیطلہ کا رخ کیا۔ دار الخلافہ پر قبضہ ہوا تو کثرت سے مال غنیمت حاصل ہوا۔ سبیطلہ کے بعد انھوں نے باقی افریقہ بھی زیر کر لیا۔ سقوط افریقہ پر ہر گھڑ سوار کو ۳ ہزار دینار ملے جب کہ پیادہ کے حصے میں ۱ ہزار آئے۔ افریقہ کی مہم پر بھیجتے وقت حضرت عثمان نے ابی سرح سے وعدہ کیا تھا کہ وہ خمس کا پانچواں حصہ بطور انعام انھیں دیں گے۔ جب انھوں نے وعدے کے مطابق ۱/۵ حصہ (کل مال غنیمت کا ۱/۲۵) خود رکھ لیا اور باقی ۴/۵ مدینہ ارسال کر دیا تو لوگ سخت ناراض ہوئے۔ وہ یہ شکایت لے کر عثمان کے پاس پہنچے تو انھوں نے یہ رقم واپس کرنے کا حکم دیا۔ جب انھوں نے مزید کہا، ہم ان کو اپنا عامل نہیں دیکھنا چاہتے تو انھوں نے ابن ابی سرح کو ہٹا کر ان کی مرضی سے عبداللہ بن نافع کو افریقہ کا گورنر مقرر کر دیا۔ اسلامی حکومت کو اس خطے سے ۱۵ لاکھ (۲۵ لاکھ: بلاذری) دینار سالانہ جزیہ حاصل ہوتا رہا۔ حضرت معاویہ کے عہد حکومت میں اہل افریقہ نے بغاوت کی جسے معاویہ بن خدیج نے رفع کیا۔

۲۷ھ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح افریقہ کی جنگ سے لوٹے تو حضرت عثمان نے انھیں مصر کا گورنر متعین کر دیا اور عمرو بن عاص کو فوج کا کمانڈر رہنے دیا۔ عمرو نے یہ کہہ کر اس عہدے سے انکار کر دیا، میں وہ گائے نہیں بننا چاہتا جس کے سینگ ایک شخص نے تھام رکھے ہوں اور دوسرا اسے دوہ رہا ہو۔ وہ مکہ چلے گئے۔ اگلے سال مصر سے مدینہ پہنچنے والے خراج کی رقم بہت بڑھ گئی تو حضرت عثمان نے عمرو سے کہا، تمھیں معلوم ہے، مصر کی اونٹنیوں کا دودھ بڑھ گیا ہے؟ عمرو نے ترت جواب دیا، ہاں! دودھ چھٹائی سے ان کے بچے بھی ہلاک ہو چکے ہیں۔

مطالعۂ مزید: الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، تاریخ الامم والملوک (طبری)، الکامل فی التاریخ (ابن اثیر)، البدایہ والنہایہ (ابن کثیر)، تاریخ الاسلام (ذہبی)، فتوح البلدان (بلاذری)، عثمان بن عفان (محمد حسین ہیکل)

ڈاکٹر محمد فاروق خان

# امام ابو حنیفہ کی شخصیت کے چند علمی پہلو موجودہ حالات کے تناظر میں

[''سیر و سوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے''۔]

سرزمین افغانستان کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ عالم اسلام کے بطل جلیل اور سب سے بڑے فقیہ امام ابو حنیفہؒ، جن کو ساری دنیا ''امام اعظمؒ '' کے نام سے جانتی ہے، کے آبا ؤ اجداد کا تعلق اسی ملک سے تھا۔ یہ بات قابلِ صد مبارک ہے کہ ''اکادمی علوم افغانستان، معاونیت بخش علوم اسلامی، مرکز تفسیر و حدیث'' نے امام صاحب کی شخصیت سے متعلق ایک بین الملی علمی و تحقیقی سیمینار کا اہتمام کیا، جو 24 تا 27 اگست 2008ء کو کابل میں منعقد ہوا۔ جس میں میں نے اپنی گفتگو میں امام صاحب کی علمی شخصیت کے چند پہلوؤں کا ذکر کیا۔

امام اعظمؒ اپنی ساری علمی زندگی کے دوران میں مکالمے پر مکمل یقین رکھتے تھے۔ اُن کے شاگرد ہر زیرِ بحث مسئلے میں اُن سے بہت تفصیلی بحث مباحثہ کرتے تھے۔ بعض مسائل پر کئی کئی دن بحث جاری رہتی تھی اور اُس کے بعد کہیں جا کر کسی رائے پر اتفاق ہو جاتا تھا۔ یہ اتفاق بھی ہمیشہ کے لیے نہیں ہوتا تھا، بلکہ امام صاحب غور و فکر کے نتیجے میں مسلسل اپنی آرا میں تبدیلیاں لاتے رہتے تھے۔ اُن کی محفل میں ہر رائے، موقف اور نقطۂ نظر کو ٹھنڈے دل سے سُنا جاتا تھا اور تنقید کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا جاتا تھا۔ امام صاحب نے کبھی بھی اپنی کسی رائے کو حرفِ آخر نہیں کہا۔ آپ فرمایا کرتے تھے:

''قولنا ھذا رای وھو احسن ماقدرنا علیہ فمن جاء نا باحسن من قولنا فھو اولیٰ بالصواب منّا''

''یہ ہماری رائے ہے۔ اتنی بات ہمارے بس میں تھی۔ جو کوئی بھی ہم سے بہتر قول لائے گا، اُس کی بات صحت سے زیادہ قریب ہوگی''۔ (تاریخ بغداد، جلد 13، صفحہ 352)

ایک دفعہ امام ابوحنیفہؒ سے پوچھا گیا کہ کیا آپ کے فتاویٰ حق ہوتے ہیں اور شک وشبہ سے بالاتر ہوتے ہیں؟۔ اس کے جواب میں امام صاحب نے فرمایا:

''مجھے نہیں معلوم۔ ممکن ہے کہ ان کا باطل ہونا زیادہ یقینی ہو''

امام زخرف کی روایت کے مطابق ایک دن امام صاحب نے اپنے شاگرد ابو یوسف سے مخاطب ہو کر کہا:

''یعقوب! میری ہر بات نہ لکھا کیجئے۔ بعض اوقات ایک بات مجھے آج سوجھتی ہے اور کل اُسے چھوڑ دیتا ہوں۔ اسی طرح کل میں ایک بات کو درست تصور کروں گا اور پرسوں اُس سے اجتناب کروں گا''۔

(تاریخ بغداد جلد 13 صفحہ نمبر 402 بحوالہ حیات حضرت امام ابو حنیفہؒ، مولف شیخ محمد ابوزہرہ، مترجم پروفیسر غلام احمد حریری صفحہ 114، 115)

امام صاحب کی شخصیت کا ایک اور پہلو یہ تھا کہ آپ سنت اور حدیث کے درمیان میں فرق کرتے تھے۔ خطیبِ بغدادی نے اپنی کتاب ''الکفایہ فی علم الروایہ'' میں اس نکتے کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔ مختلف حنفی علما اسے سُنت معلومہ، سُنت مشہورہ، سُنت متواترہ اور تواتر عملی جیسے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ اس سے اُن کی مراد یہ ہوتی ہے کہ روزمرہ معاملات کی کوئی بات جس پر حضور اور صحابہ ساری زندگی عمل پیرا رہے، اور اُس کے متعلق ہمارا یقین ہے کہ پچھلی دہائیوں میں اس پر متواتر عمل کیا جاتا رہا ہے، تو اس عمل کو ہم سُنت متواترہ کا درجہ دیں گے اور اگر کوئی خبر واحد بظاہر اس عمل سے ٹکراتی ہے تو ہم اُس خبر واحد کی تاویل کریں گے۔ مناقب مکی میں مذکور ہے کہ:

''ابوحنیفہ اپنے شہر والوں کے مسلک کا شدید اتباع کرتے تھے''۔ (المناقب المکی، جلد 1، صفحہ 90)

گویا امام صاحب کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ جس بات پر حضور اور صحابہ کرام نے مسلسل عمل کیا ہے، اُس پر ابھی تک سارے عالم اسلام میں عمل جاری ہے۔ لہٰذا یہی عمل اجماع کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ یہی وہ چیز ہے جسے فقہ مالکی میں ''عمل اہل مدینہ'' کہا گیا ہے۔ گویا امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ دونوں اس بات کے قائل تھے۔

میرے نزدیک رفع یدین سے متعلق ان دونوں عظیم فقہا کا مسلک سُنت وحدیث کے اسی فرق پر مبنی تھا۔ یعنی چونکہ اُس وقت مدینہ اور کوفہ دونوں میں نماز کے وقت پہلی تکبیر پر رفع یدین کیا جاتا تھا، اس لیے اُن کا نقطۂ نظر یہ بنا کہ تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین سُنت ہے اور اس کے علاوہ باقی اوقات میں رفع یدین مباحات کے درجے میں ہے۔

امام صاحب کی شخصیت کا تیسرا اہم پہلو یہ تھا کہ وہ احادیث کے متعلق نہایت متوازن نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ وہ اخبارِ آحاد کو قرآن وسُنت اور عقلِ عام کی روشنی میں دیکھتے تھے اور یہ بھی دیکھتے تھے کہ آیا حضور نے کوئی بات بحیثیتِ پیغمبر کہی ہے اور یا پھر بحیثیت حکمران، قاضی یا انسان ہونے کے ناطے سے کہی ہے۔ گویا امام صاحب کے نزدیک یہ ممکن نہیں تھا کہ کوئی حدیث، قرآن مجید یا عقلِ عام کے تقاضوں کے خلاف ہو۔ سہل نے کہا کہ:

''ابوحنیفہ کا علم ایک عامی علم ہے'' (المناقب المکی جلد 1 صفحہ 82)

درج بالا فقرے کا مطلب یہ ہے کہ امام صاحب دین کے معاملے میں عقل عام (Common sense) پر یقین رکھتے تھے۔ امام ابوحنیفہؒ پر یہ اعتراض کیا جاتا تھا کہ آپ قیاس اور استحسان کے مقابلے میں حدیث کو چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ اعتراض علی الاطلاق صحیح نہیں ہے۔ کسی بھی حدیث سے کوئی حکم مستنبط کرتے وقت یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس کا سیاق وسباق کیا تھا، یہ بات حضور نے کون سے وقت میں ارشاد فرمائی تھی، کیا اُس وقت کوئی مخصوص صورت حال تو نہیں بنی ہوگی، کیا روایت اتنی مختصر ہے کہ روایت سے ان سب امور کا پتہ چل سکتا ہے یا نہیں۔ چنانچہ امام صاحب نے مختلف معاملات میں قیاس کو اس وجہ سے ترجیح دی ہے کہ قیاس کی بنیاد قرآن مجید اور عقل وفطرت کی مسلمہ اُصولوں پر ہوتی ہے۔ کسی تفصیلی روایت کا قیاس سے تعارض ممکن ہی نہیں، البتہ اُن معاملات میں قیاس کو ترجیح دی جائے گی جہاں روایت میں درج بالا کوئی خلا پایا جاتا ہو۔ تقریباً یہی نقطۂ نظر امام مالک کا بھی تھا۔ جس طریقے کو امام ابوحنیفہؒ قیاس اور استحسان کہتے ہیں، اُسی کو امام مالکؒ ''مصالح مرسلہ''، ''استصلاح'' یا ''رفع درج'' قرار دیتے ہیں۔ مثلاً جن روایات میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ اگر کسی برتن میں کتا منہ ڈال لے تو اُس کو سات مرتبہ دھویا جائے، اس کے متعلق امام مالکؒ نے کہا ''جب کتے کا کیا ہوا شکار حلال ہے تو اس کا لُعاب کیسے مکروہ ہوسکتا ہے''۔ چنانچہ امام مالکؒ نے اس روایت کی یہ تاویل کی کہ یہاں دراصل بیمار کتا مُراد ہے۔ واضح رہے کہ امام مالکؒ اس حدیث کو خود بھی اپنی کتاب 'موطا' کے باب جامع الوضو میں لائے ہیں۔ اس کے باوجود انھوں نے یہ ضروری سمجھا کہ قرآن مجید کی روشنی میں اس حدیث کی تحدید کی جائے۔

اسی طرح یہ بھی کہا جاتا ہے کہ امام صاحب کو کچھ احادیث کا علم نہ تھا، اس لیے اُن معاملات میں امام صاحب نے بظاہر اُن روایات کے مطابق فتویٰ نہیں دیا۔ میرے نزدیک یہ بات صحیح نہیں، اس لیے کہ امام صاحب نے بکثرت حج کیے تھے۔ اُموی دور میں جب ابنِ ہبیرہ کوفہ کا حاکم تھا، امام صاحب کسی حکومتی منصب کو قبول کرنے سے بچنے کے لیے مکہ معظّمہ چلے گئے اور اندازاً چھ برس تک وہاں مقیم رہے۔ ظاہر ہے کہ اس پورے وقت کے دوران میں

امام صاحب کو مکے اور مدینے کے بہت سارے علما سے استفادے اور مکالمے کا موقع ملا ہوگا، چنانچہ یہ ممکن نہیں کہ کوئی اہم حدیث اُن کی نظروں سے اوجھل ہوگئی ہو۔ میرے نزدیک اصل حقیقت یہی ہے کہ آپ ایک طرف سُنت اور حدیث میں فرق کرتے تھے اور دوسری طرف آپ کسی روایت سے حکم اخذ کرتے وقت درج بالا سب پہلوؤں کا خیال کرتے تھے اور ان سب پہلوؤں کو سامنے رکھ کر کسی حدیث کی تعبیر و تاویل کرتے تھے۔

امام صاحب کی شخصیت کا چوتھا پہلو اُس وقت کے سیاسی معاملات میں اُن کا طرزِ عمل تھا۔ امام صاحب نے اپنی زندگی کے باون برس بنو اُمیہ کے دور میں بسر کیے اور اٹھارہ برس بنو عباس کے دور میں بسر کیے۔ گویا آپ نے عالم اسلام کا ایک نہایت پُر آشوب دور دیکھا جس میں ہر طرف جنگیں، بغاوتیں اور شورشیں تھیں۔ آپ کے وقت میں خارجی بھی کوفہ پر قابض ہوئے اور معتزلہ بھی اس دور میں نمودار ہوئے۔ سیاسی معاملات میں امام ابوحنیفہؒ کے نقطۂ نظر سے متعلق روایات میں باہم بہت تضاد ہے، تاہم متفق علیہ باتیں یہ ہیں کہ آپ اُموی حکمرانوں کو بہت بُرا سمجھتے تھے۔ اُموی حکمرانوں کے وقت میں زید بن علی اور اُن کے فرزند یحییٰ کی بغاوت سے آپ کو ہمدردی تھی۔ بنی اُمیہ کے دور میں آپ نے سرکاری عہدہ قبول کرنے سے انکار کر دیا اور مکہ معظّمہ تشریف لے گئے۔ آپ بنو عباس کی حکومت قائم ہونے کے بعد واپس کوفہ آ گئے۔ آپ نے شروع میں عباسی حکومت کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا، تاہم جب بنو عباس نے آمرانہ استبداد سے کام لینا شروع کیا تو آپ نے بنو عباس پر تنقید کی۔ اگرچہ خلیفہ منصور سے ایک لمبے عرصے تک آپ کے دوستانہ مراسم قائم رہے تاہم جب نفسِ زکیہ نے 145 ہجری میں مدینہ منورہ میں منصور کے خلاف بغاوت کی تو امام صاحب کی ہمدردی نفسِ زکیہ کے ساتھ تھی۔ منصور نے امام صاحب کو اپنے حلقۂ دام میں لانے کے لیے اُن کو قاضی القضاۃ کا منصب پیش کیا۔ چونکہ امام صاحب کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ آپ بطورِ قاضی القضاۃ منصور کے مظالم پر خاموش رہیں، اس لیے آپ نے یہ منصب قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے نتیجے میں منصور کو یہ موقع ملا کہ وہ آپ کو قید کر دے۔ بعد میں آپ کو اپنے گھر میں نظر بند کر دیا گیا اور اسی حالت میں آپ کی وفات ہوئی۔

یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ ان تمام پُر آشوب ادوار میں آپ نے مسلسل تعلیم و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا، آپ نے حکومت کے خلاف بغاوتوں میں کوئی عملی حصہ نہیں لیا اور آپ نے کسی حکومت کے خلاف کوئی مہم نہیں چلائی، بلکہ صرف اپنے درس و تدریس کے دوران میں کبھی کبھی اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کرتے تھے۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں تھا۔ میرے نزدیک اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ امام صاحب کے نزدیک ایک عالم کا اصل کام یہ ہے کہ وہ مسلسل

معاشرے کی تعلیم و تربیت کرتا رہے۔ اگر یہ تعلیم و تربیت مسلسل جاری رہے تو بُرے حکمرانوں کے باوجود مسلمانوں کا معاشرہ دین کی بنیادوں پر قائم رہتا ہے۔ یہ بڑی اہم بات ہے کہ اُس زمانے میں امام مالک نے بھی بالکل یہی طرزِ عمل اپنایا یہ بات سورہ توبہ کی آیت نمبر 122 کے بھی عین مطابق ہے۔ پچھلے چودہ سو برس میں علما کی ایک بہت بڑی تعداد اسی طرزِ عمل پر کاربند رہی ہے۔ جب بھی علما نے اصولی بات کہنے کے بجائے سیاسی جدوجہد یا کسی مسلح بغاوت میں حصہ لیا، اُس کے نتائج عمومی طور پر اُمت مسلمہ کے لیے اچھے نہیں نکلے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا امام ابوحنیفہؒ کے اُس زمانے میں موقف کے متعلق روایات میں تضاد موجود ہے۔ اُن میں سے کچھ روایات ایسی ہیں جو امام صاحب کی شخصیت سے لگاّ نہیں کھاتیں۔ مثال کے طور پر 'المناقب لابن البزازی' جلد 1 صفحہ 55 کے مطابق امام صاحب نے کہا کہ زید بن علی کا جہاد جنگ بدر کے مشابہ ہے، تاہم چونکہ آپ کے پاس لوگوں کی امانتیں تھیں اس لیے آپ نے اس جنگ میں عملی شرکت نہیں کی۔ ایک اور روایت کے مطابق چونکہ آپ کو یہ خدشہ تھا کہ زید بن علی کے ساتھی اُن کو چھوڑ دیں گے اس لیے آپ اس جنگ میں شریک نہیں ہوئے۔ میرے نزدیک درج بالا روایت صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ امام صاحب کی پوری زندگی ہمیں یہ بتاتی ہے کہ آپ کا ظاہر و باطن ایک دوسرے سے مختلف نہیں تھا۔ آپ بڑے بہادر تھے، مشکلات میں کبھی ہمت نہ ہارتے اور مسائل و مصائب کا بڑی خندہ پیشانی سے سامنا کرتے۔ اس لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ ایک ایسی جنگ میں شریک نہ ہوں جس کو آپ خود جنگ بدر سے مشابہت دیتے تھے اور شرکت نہ کرنے کے لیے ایسی وجوہات بیان کریں جو بڑی کمزور ہیں۔

اسی طرح یہ روایت بھی بیان کی جاتی ہے کہ آپ کے مطابق خلیفہ منصور کے خلاف نفسِ زکیہ کی بغاوت کا ساتھ دینے میں پچاس نفلی حجوں سے زیادہ ثواب ہے۔ میرے نزدیک یہ روایت بھی صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ اگر ایسا ہوتا تو امام صاحب بنفسِ نفیس اس خروج میں حصہ لیتے۔ امام صاحب نے عزیمت سے بھرپور زندگی گزاری۔ آپ ایک عالم باعمل تھے۔ چنانچہ یہ ممکن نہیں کہ ایسی بات کہنے کے باوجود آپ اور آپ کے شاگرد اطمینان سے اپنے درس و تدریس میں مشغول رہتے۔ حقیقت یہ ہے کہ امام صاحب نے ''افضل الجہاد من قال کلمتاً حقاً عند سُلطانٍ جائرٍ'' کے مطابق زندگی بسر کی اور ایک عالم کے لیے اسی روایت کے مطابق حق بات کہنے کو عملی جدوجہد کی آخری حد قرار دیا۔

آج کیا ہونا چاہیے؟

امام صاحب کی عملی زندگی اور طرزِ عمل سے آج بھی ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ مثلاً امام صاحب نے دین کی

تحقیق میں مکالمے کا جو رواج ڈالا تھا اُس کو آج پھر زندہ ہونا چاہیے۔ بدقسمتی یہ ہوئی کہ امام صاحب ہی کے پیروکاروں نے بعد میں فقہ حنفی کی ہر بات کو حرفِ آخر قرار دے کر تقلید کا ڈول ڈالا۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ سب اہم مسائل پر ایک دفعہ پھر سنجیدہ مکالمہ شروع کیا جائے۔ اس طرح مختلف مسالک آپس میں ایک دوسرے کے قریب آسکیں گے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ عالم اسلام کم از کم چھ بظاہر ناقابل عبور حصوں (Water tight compartments) میں تقسیم ہو چکا ہے جن کے درمیان مناظرہ ومجادلہ تو موجود ہے مگر مکالمہ نہیں ہے۔ حالانکہ یہ ضروری ہے کہ قرآن مجید سے اَخذ کردہ اُصولوں کی بنیاد پر، اُمت مسلمہ کے لیے آسانی اور مصلحت کو سامنے رکھتے ہوئے کھلے ذہن کے ساتھ مکالمہ شروع کیا جائے۔ بہت مناسب ہوگا کہ اہلِ علم مسالک کی تنگ نائیوں سے بالاتر ہو جائیں۔ خود یہ عاجز بحیثیت ایک طالب علم کے جمع بین الصلاتین میں حنفی مسلک کو تیسیر کے اُصولوں کے مطابق نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک فاتحہ خلف الامام میں امام احمد بن حنبل کا نقطۂ نظر نماز کی روح اور ارتکازِ توجہ سے قریب تر ہے۔ اسی طرح طلاق ثلاثہ در مجلسِ واحد میں امام ابن تیمیہؒ کے نقطۂ نظر میں اُمت مسلمہ کے لیے وسعت اور آسانی ہے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ سنت کی ایک جامع اور واضح تعریف کی جائے۔ سنت کے تحت جتنے عملی اُمور آتے ہیں اُن کی بنیادوں پر اُمت کے تمام مسالک کا آپس میں اتفاق ہے۔ اگر ان کو نمایاں کیا جائے اور لوگوں کو یہ تعلیم دی جائے کہ یہی متفق علیہ دائرہ ہی واجب اتباع ہے، تو اس طرح مختلف مسالک ایک دوسرے کے بہت قریب آسکیں گے اور اختلاف کے بجائے اتفاق کو ترجیح حاصل ہو جائے گی۔ میرے اُستاد جاوید احمد غامدی نے اِس ضمن میں ایک جامع فہرست مرتب کی ہے۔ اُس کو بنیاد بنا کر اہل علم اس پر مزید غور وفکر کر سکتے ہیں۔ تیسرا اہم کام یہ ہے کہ علم فقہ سے متعلق نئی درسی کتب تحریر کی جائیں۔ فقہ کی پرانی کتابوں سے ہم رہنمائی ضرور حاصل کر سکتے ہیں مگر وہ ہمارے لیے تین وجوہات سے زیادہ فائدہ مند نہیں رہیں۔ پہلی وجہ یہ کہ ان کتابوں میں دین اور اجتہاد میں فرق نہیں کیا گیا۔ حالانکہ یہ ضروری ہے کہ علمی کتابوں میں ہر مسئلے سے متعلق پہلے قرآن مجید کے سارے متعلقہ حصے نقل کیے جائیں۔ پھر اس ضمن میں ساری احادیث کو بیان کیا جائے۔ یہی اصل دین ہے۔ اس کے بعد تعبیر اور اجتہاد کا دائرہ شروع ہو جاتا ہے۔ چونکہ اجتہاد، وقت اور حالات اور مزید غور وفکر کے ساتھ بدلتا رہتا ہے اس لیے یہ مستقل دین کا حصہ نہیں ہے۔ اجتہاد

وتعبیر کے دائرے میں ہر مسلک کا نقطۂ نظر اور اُس کے دلائل بیان کرنے سے ہر طالب علم اور صاحب علم کے ذہن میں وسعت پیدا ہوگی۔

فقہ کی پرانی کتابیں ایسے مسائل اور مثالوں سے بھری پڑی ہیں جن کا آج کے حالات سے کوئی تعلق نہیں ہے اور ان میں بے شمار فرضی مسائل پر بحث مباحثہ کیا گیا ہے۔ مثلاً وضو جیسی سادہ چیز کی مثال لے لیجیے، جس کو قرآن مجید نے ایک آیت میں بیان کر دیا ہے، جس کے متعلق صحیح احادیث کی تعداد چند ایک ہے، اور جس کو اربوں مسلمان روزانہ کرتے ہیں۔ اتنی آسان چیز کو فقہی کتابوں میں اتنا مشکل بنا دیا گیا ہے اور اُن میں ایسے ایسے مسائل سے بحث کی گئی ہے جن کا عملی زندگی سے دور دور کا کوئی تعلق بھی نہیں۔ مثلاً وضو کی بحث عبدالرحمان الجزیری نے اپنی کتاب ''کتاب الفقہ علیٰ مذاہب الاربعہ'' میں سینکڑوں صفحات میں کی ہے اور اُس میں اس طرح کے مسائل پر بحث کی گئی ہے جیسے یہ کہ چہرے کا حدود اربعہ کیا ہے، یا پیشانی سے کیا مراد ہے، یا یہ کہ گنجے آدمی کی پیشانی کہاں ختم ہو جاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ ایک اہم سوال جس پر ایک لمبی بحث کی گئی ہے یہ ہے کہ اگر کوئی انسان وضو کرنے کے بعد مُرتد ہو جائے، اس کے بعد وہ پھر اسلام قبول کر لے تو کیا اُس کا پرانا وضو قائم رہے گا یا نہیں۔ معلوم نہیں اُمت مسلمہ کی پچھلی چودہ سو سالہ تاریخ میں ایسا کوئی واقعہ پیش آیا بھی ہوگا یا نہیں۔

میرے نزدیک کرنے کا تیسرا کام یہ ہے کہ اُن مسائل کی طرف توجہ دی جائے جن پر عالم اسلام کا تعلیم یافتہ طبقہ بہت بڑے خلجان کا شکار ہے۔ آج انھی مسائل پر توجہ ہماری سب سے بڑی ضرورت ہے۔ مثلاً یہ کہ اسلام اور جمہوریت کا آپس میں کیا رشتہ ہے۔ اسلامی اخوت اور ''نیشن سٹیٹ'' کے درمیان کہاں حد فاصل ہے۔ کیا اسلام میں آزادئ رائے اور مذہب کے رد و قبول کی گنجائش ہے۔ قتال و جہاد کا تصور کیا ہے۔ خواتین کے حقوق کیا ہیں اور وہ آج کل جن مشکلات سے دوچار ہیں اُن کا مداوا کس طرح ہو سکتا ہے۔ دین کی کون سی ہدایات ریاستی طاقت کے ذریعے سے نافذ کی جا سکتیں ہیں۔ کیا اسلام فنونِ لطیفہ کی اجازت دیتا ہے۔ کیا اسلام میں غلامی بحیثیت ادارہ موجود ہے۔ آج کے زمانے میں اسلام کے قانون جرائم و سزا کو کس طرح نافذ کیا جائے اور اس ضمن میں زمینی حقائق اور دینی احکامات میں کس طرح ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ اسلام کے مقامی کلچر اور گلوبلائزیشن میں کیا اصولی رشتہ ہے۔

یہی وہ علمی سوالات ہیں جن کے جواب پر اُمت مسلمہ کے مستقبل کا انحصار ہے۔ اہل علم کو سب سے بڑھ کر انھی کی طرف توجہ دینی چاہیے۔

گل رحمان ہمدرد

# برصغیر میں اسلامی جدیدیت کے ماخذ

گذشتہ سے پیوستہ

(۲)

جس شخص کی اپنی ذہنیت قدامت پسندانہ ہو وہ تجدید واحیاے دین کے حوالے سے کوئی بڑی خدمت انجام دے ہی نہیں سکتا اور جو شخص تجدیدِ دین کے میدان میں کوئی کام کرنے کا اہل نہیں ہے اُسے تجدید کے گر سکھانا تضیع اوقات کے زمرے میں آتا ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے قدامت پسندانہ ذہنیت رکھنے والوں کو ایک ایک کر کے اپنے حلقہ سے نکال باہر کیا اور صرف اُنھی نوجوانوں کو اپنے پاس رکھا جو اپنے آئینہ کو بچا بچا کر رکھنے والے نہ تھے۔ جاوید احمد غامدی اُنھی نوجوانوں میں سے ایک تھے۔ وہ ابوالکلام کی طرح نوعمری میں ہی نمایاں ہو گئے تھے اور اُنھوں نے اپنے سے عمر میں بڑے لوگوں کو متاثر کیا۔ جب وہ جماعتِ اسلامی میں تھے تو جماعت کے بزرگ اراکین محفلوں کا انتظام کر کے اُن کو تقریر کے لیے بلایا کرتے تھے۔ اُس وقت اُن کی عمر پچیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ چھبیس سال کی عمر میں اُنھوں نے ابوالاعلیٰ مودودی کے سامنے ایک تحقیقی ادارہ قائم کرنے کی تجویز رکھی اور اپنی مالی مشکلات کا ذکر کیا۔ جماعتِ اسلامی کے دینی مستقبل سے مایوس ابوالاعلیٰ مودودی نے اُن کی تجویز کو سراہا اور مالی معاونت کی یقین دہانی کرائی۔ بینک میں ابوالاعلیٰ مودودی اور جاوید احمد غامدی کے نام سے مشترکہ اکاؤنٹ کھولا گیا اور پھر ہر مہینہ مودودی صاحب اپنی مقررہ رقم اس کارِ خیر کے لیے اُس اکاؤنٹ میں جمع کیا کرتے تھے۔ اُن کی وفات تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ابوالاعلیٰ مودودی سے غامدی صاحب کی آخری ملاقات 1979ء میں اُس وقت ہوئی جب وہ بغرضِ علاج امریکہ تشریف لے جا رہے تھے۔ اس کے بعد پھر اِن دونوں کی ملاقات نہ ہو سکی۔ ابوالاعلیٰ مودودی ہمیشہ ہمیشہ کے

لیے اس دنیا کو خیر آباد کہہ گئے اور غامدی صاحب اُس کام کے لیے تنہا رہ گئے جو اُنھیں ابوالاعلیٰ کی سرپرستی میں کرنا تھا۔

ماو مجنوں ہم سفر بودیم در دیوان عشق

او بہ صحرا رفت و مادر کوچہ ہا رسوا شدیم

لیکن غامدی صاحب نے حوصلہ نہیں ہارا اور اپنے مشن میں پیہم مگن رہے۔ اس دوران خود ابوالاعلیٰ کے پیروکاروں کی جانب سے بھی زبردست مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

1987ء میں قاضی حسین احمد نے جماعتِ اسلامی کی قیادت سنبھالی۔ قاضی صاحب ایک وسیع القلب اور وسیع النظر انسان ہیں۔ اُن کے دورِ امارت میں یہ ٹوٹا ہوا رشتہ دوبارہ بحال ہوا۔ اور اب جوں جوں وقت گزرتا چلا جا رہا ہے جماعتِ اسلامی اور حلقۂ امین احسن ایک دوسرے کے قریب آتے چلے جا رہے ہیں۔ اس مصالحت میں ایک اہم رول وہ صحافی ادا کر رہے ہیں جو جماعتِ اسلامی کے عقیدت منداورتحریکِ تدبرالقرآن کے خوشہ چین ہیں۔ اس ضمن میں ارشاد احمد حقانی، عبدالقادر حسن، مجیب الرحمان شامی (چیف ایڈیٹر روزنامہ پاکستان)، مہتاب خان (چیف ایڈیٹر روزنامہ اوصاف)، سہیل قلندر (چیف ایڈیٹر روزنامہ ایکسپریس)، ہارون الرشید، عرفان صدیقی، حسین احمد پراچہ، حامد میر، شاہد مسعود، آفتاب اقبال، جاوید چودھری، سلیم صافی اور طلعت حسین کی شعوری و لاشعوری کاوشیں خاص طور پر قابلِ تعریف ہیں۔ دوسری جانب اہلِ بصیرت سے یہ بات مخفی نہیں کہ جماعتِ اسلامی مستقبل میں جن ہاتھوں میں منتقل ہو رہی ہے وہ جناب جاوید احمد غامدی کے تربیت یافتہ ہوں گے۔ حقیقی جمہوریت پر یقین رکھنے والے، اعلیٰ تحقیقات کے پرستار، تجدید و احیاے دین کے حامی، سیاسیات کے اسرار و رموز سے واقف، اور روشن خیال و روشن ضمیر لوگ جب جماعت کو سنبھالیں گے تو قضا و قدر کی مخفی قوتیں اُن کے ہم رکاب ہوں گی۔ جماعتِ اسلامی کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ فردِ واحد کی ''تقلید'' ہے۔ تقلید کے بجاے اگر تحقیق کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنے اہداف تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

جاوید احمد غامدی کی کامیابیاں صرف جماعتِ اسلامی، مسلم لیگ اور تحریکِ انصاف کی ''فتح'' تک محدود نہیں ہیں۔ بلکہ تمام شعبۂ ہاے زندگی میں یہی انقلابی عمل کارفرما ہے۔ یہ وہ عمل ہے جس کو ابوالاعلیٰ مودودی تطہیرِ افکار کہا کرتے تھے اور یہ حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے ابتدائی لوازم میں سے ہے۔

وہ لوگ جنھوں نے جمال الدین افغانی کی فکر کو ''فتنۂ انکارِ امامت''، اقبال کے نظریات کو ''فتنۂ انکارِ طریقت''،

ابوالکلام کی سوچ کو ''فتنہ انکارِ ولایت''، ابوالاعلیٰ کے نظریات کو ''فتنۂ انکارِ خلافت'' اور امین احسن کی فکر کو ''فتنۂ انکارِ سنت'' قرار دیا تھا۔ اُنھوں نے وہ ''معرکہ کہن'' آج پھر تازہ کر رکھا ہے اور غامدی صاحب کی فکر کو ''فتنۂ انکارِ شریعت'' قرار دے کر اس نئے ''فتنہ'' کی سرکوبی کے لیے ''خدمات'' انجام دے رہے ہیں۔ گذشتہ تاریخ یہی بتاتی ہے کہ ہر مرتبہ اِن لوگوں کو شکست اور ''فتنہ گروں'' کو فتح حاصل ہوئی ہے اور اہلِ بصیرت دیکھ رہے ہیں کہ اس مرتبہ بھی انجام ماضی سے مختلف نہیں۔ تاریخ اپنے آپ کو دہرانے لگی ہے۔ وہ لوگ جو کل تک ابوالاعلیٰ مودودی کی فکر کو ''فتنۂ مودودیت'' قرار دے رہے تھے۔ آج اُنھی کے فکر و منہاج پر عمل پیرا ہیں۔ اسی طرح آج جو لوگ جاوید احمد غامدی کی فکر کو ''فتنۂ غامدیت'' قرار دے رہے ہیں۔ وہ وقت دور نہیں ہے کہ یہی لوگ غامدی صاحب کے فکر و فلسفہ پر عمل پیرا ہو جائیں گے۔

بھارت میں امین احسن اصلاحی کی تحریک کی قیادت ادراہ علوم القرآن علی گڑھ کے روحِ رواں ڈاکٹر عبید اللہ فراہی کے ہاتھ میں ہے اور جاوید احمد غامدی کے متوقع جانشین بھی وہی ہیں۔ احمد جاوید اور ڈاکٹر ذاکر نائیک کی طرح ڈاکٹر عبید اللہ فراہی کو بھی کئی چیلنج درپیش ہیں، پہلا چیلنج یہ ہے کہ انھیں اپنے مکتبِ فکر کی عظیم تحقیقی روایت کو ہر حال میں برقرار رکھنا ہے۔ دوسرا چیلنج یہ ہے کہ جس رفعت پر دوسروں کی سانس ٹوٹنے لگتی ہے، غامدی صاحب وہاں سے اپنی پرواز کا آغاز کرتے ہیں۔ اب غامدی صاحب کی پرواز جہاں ختم ہوتی ہے، ڈاکٹر عبید اللہ فراہی کو وہاں سے اپنی پرواز کا آغاز کرنا ہے اور یہ ایک بہت ہی مشکل کام ہے۔ تیسرا بڑا چیلنج اُن کے سامنے یہ ہے کہ وہ بھارت کے باسی ہیں جہاں قدامت پسندی کی جڑیں پاکستان کی نسبت زیادہ گہری اور مضبوط ہیں۔ لہٰذا اُنھیں زیادہ مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ حال ہی میں شائع ہونے والی اُن کی کتاب ''تصّوف-ایک تجزیاتی مطالعہ'' پر یارانِ طریقت نے جس قدر ہنگامہ آرائی کی، وہ کس سے پوشیدہ ہے لیکن یہ تو ابھی ابتداے عشق ہے۔ مستقبل میں جوں جوں اُن کی تخلیقات اور تصانیف و تالیفات کی تعداد بڑھتی چلی جائے گی اور اُن کی دعوتی و تبلیغی سرگرمیوں میں بھی ذرا اور تیزی آ جائے گی تو مخالفت میں بھی اُسی رفتار سے اضافہ ہوتا رہے گا۔ ہم ڈاکٹر عبید اللہ فراہی سے یہی عرض کریں گے کہ وہ اس معاملہ میں ڈاکٹر ذاکر نائیک کی تقلید کریں۔ جس طرح وہ زمانے کی مخالفت کی پروا کیے بغیر اپنے کام میں مگن رہتے ہیں، اسی طرح عبید اللہ صاحب کو بھی ادھر اُدھر سے نظر بچا کر صرف اپنے کام پر توجہ دینی چاہیے۔

شاہیں تری پرواز سے جلتا ہے زمانہ
تو اور اسی آگ کو بازو سے ہوا دے

ان سلسلوں کی درجہ بندی ہم یوں کر سکتے ہیں۔

مذہبی وخانقاہی قدامت پسند　　سائنسی و لادین جدت پسند

## اعتدال پسند

### سید جمال الدین افغانی

سوڈان　ترکی　عراق　ایران　افغانستان　حجاز　مصر　لیبیا

### ہندوستان

### شبلی نعمانی

| | | | |
|---|---|---|---|
| سید سلیمان ندوی | عبدالماجد دریا آبادی | ابوالکلام آزاد | حمید الدین فراہی |
| ابوالحسن علی ندوی | شیخ احمد حسین دیدات | ابوالاعلیٰ مودودی | امین احسن اصلاحی |
| ڈاکٹر حمید اللہ | وحید الدین خان | ڈاکٹر اسرار احمد | جاوید احمد غامدی |
| ڈاکٹر محمود احمد غازی | ڈاکٹر ذاکر عبدالکریم نائیک | احمد جاوید | ڈاکٹر عبید اللہ فراہی |

مستقبل میں بھی دبستانِ شبلی کے یہی چار سلسلے اسی شان کے ساتھ جاری رہیں گے۔ اگر کسی شخص کے اپنے حلقہ میں اُس کا جانشین پیدا نہ ہوا تو دور کے کسی حلقہ یا یونیورسٹی سے اس کا جانشین سامنے آئے گا۔ بلکہ یونیورسٹیوں میں مذہبی علوم کے اعلیٰ انتظامات اور تحقیق کی جدید سہولتوں کے باعث اب کسی شخص کے جانشینوں کی تعداد ایک سے زیادہ بھی ہوسکتی ہے۔ لیکن یہ یاد رکھیے کہ آئندہ ''ڈگمگاتے قدم'' لینے والوں کے لیے اس فہرست میں کوئی جگہ نہ ہوگی۔ بلا وجہ قرآن اور اسلام کے نام پر تحریکیں شروع کرنے والے جاہل پمفلٹ فروش اور جگہ جگہ جا کر تقریر کرنے والے حضرات بھی اس میں جگہ نہیں پا سکیں گے۔ اسی طرح کتابوں کی الماری کے سامنے تصویر کھنچوا کر اخبارات میں اپنے مضمون کے ساتھ شائع کروانے والے اور اپنے چہروں پر سنجیدگی کی مصنوعی کلغی سجا کر ٹی وی سکرین پر آنے کے شوقین حضرات بھی اس فہرست میں جگہ نہیں پا سکیں گے۔ اب صرف اعلیٰ درجہ کے تنہا پسند محققین ہی اس فہرست میں جگہ پا سکیں گے۔

شہپرِ زاغ و زغن در بندِ قید و صید نیست
ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند

دبستانِ شبلی کے متوازی ایک اور دبستان بھی ہے اور وہ بھی اُتنی ہی اہمیت کا حامل ہے جتنا کہ دبستانِ شبلی ہے۔ اور یہ اُن فلسفی مفکرین کا گروہ ہے جنھوں نے فلسفہ پڑھا، فلسفہ میں ایم۔فل کیا، فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور پھر اپنے قلم کو اسلام کے حق میں استعمال کیا۔ برصغیر میں ڈاکٹر شیخ محمد اقبال اس گروہ کے بانی ہیں۔ اُن کے علاوہ ڈاکٹر سید ظفر الحسن، ڈاکٹر افضال حسین قادری، ڈاکٹر محمد محمود احمد، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر میر ولی الدین، ڈاکٹر میاں محمد شریف، ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ڈاکٹر برہان احمد فاروقی، ڈاکٹر عشرت حسن انور، ڈاکٹر عبدالحمید کمالی، ڈاکٹر سعید علی شیخ، ڈاکٹر قاضی عبدالقادر، ڈاکٹر فضل الرحمٰن، ڈاکٹر جاوید اقبال، ڈاکٹر اسرار عالم، ڈاکٹر عبدالخالق، ڈاکٹر منظور احمد، ڈاکٹر وحید عشرت، ڈاکٹر مصلح الدین، ڈاکٹر سید اظہر علی رضوی، ڈاکٹر شجاع الحق، ڈاکٹر ابصار احمد، ڈاکٹر احمد رفیق اختر اور ڈاکٹر خضر یاسین، یہ سب اسی جماعت کے اکابر ہیں۔ یہ لوگ مولانا جلال الدین رومی سے متاثر تھے اس لیے میں اس دبستان کو ''دبستانِ رومی'' کہتا ہوں۔ اس گروہ کے اکابرین مغربی فلسفہ اور عجمی تصوّف کے دلدادہ تو تھے ہی لیکن اُن میں سے بعض جزوی طور پر فتنۂ اشتراک کی زد میں بھی آئے اور بعض کسی حد تک لادینیت سے متاثر ہو گئے۔ بعض نے بلا تکلف قدامت پسندی کا لبادہ اوڑھ لیا۔ بعض عمر بھر تحریکِ علی گڑھ کے زیرِ اثر رہے۔ بعض نے اقبال کے متن کی تشریح کو ہی مشغلۂ حیات بنالیا۔ بعض سفر شروع کرنے سے پہلے ہی حوصلہ ہار گئے۔ کچھ تھوڑے آگے جا کر رُک گئے۔ کچھ جتنے آگے گئے اُس سے کہیں زیادہ پیچھے چلے گئے۔ صرف چند ہی لوگ ہیں جو عمر بھر رومی کے اس مسلک پر عمل پیرا رہے کہ چند خوانی حکمتِ یونانیاں --- حکمت قرآنیہ را ہم بخواں، اور اُن میں سے سرفہرست خود علامہ اقبال کی ذات ہے۔

پھر اقبال کی ذات سے ماہرین اقبالیات کا ایک علیحدہ سلسلہ وابستہ ہے۔ جن لوگوں نے فکر اقبال کو اپنے فرقہ وارانہ نظریات کی تائید وحمایت، اشتراکی سوچ اور لادین جدّت پسندی کے حق میں استعمال کیا اور کلامِ اقبال کی من مانی تاویلیں پیش کیں، اُنھیں ماہرین اقبالیات نہیں کہا جا سکتا۔ وہ فکرِ اقبال میں تحریف کے مرتکب ہونے کے باعث ''محرفین اقبالیات'' ہیں۔ اگرچہ فلسفی مفکرین نے اقبال پر قابلِ قدر کام کیا ہے، لیکن اُن کو بھی ہم معروف معنوں میں ماہر اقبالیات نہیں کہہ سکتے، کیونکہ وہ ماہر اقبالیات ہونے کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت کچھ تھے۔ حقیقی ماہرین اقبالیات کے تین سلسلے ہیں۔ ماہرین اقبالیات کی پہلی نسل ابوالکلام آزاد کی فکر کے زیرِ اثر پروان چڑھی تھی۔

اس لیے اس سلسلے کو ''دبستانِ آزاد'' کہہ سکتے ہیں۔ سید نذیر نیازی، مولانا غلام رسول مہر، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، پروفیسر یوسف سلیم چشتی، فقیر وحید الدین، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، مولانا عبدالمجید سالک، میاں محمد شفیع، ڈاکٹر عبدالمغنی، محمد احمد خاں، محمد منور مرزا، اعجاز الحق قدوسی، شورش کاشمیری، ان سب کی جوانی الہلال اور البلاغ کی ورق گردانی میں گزری تھی اور ان میں سے غلام رسول مہر اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسم تو ابوالکلام کی حزب اللہ میں بھی شامل تھے۔ اِس سلسلہ کے لوگ ابوالکلام کی طرح ادب و تاریخ میں دلچسپی رکھتے تھے اور اُنھوں نے اقبال پر ادبی و تاریخی نوعیت کا کام کیا ہے۔

ماہرینِ اقبالیات کی دوسری نسل وہ تھی جس کی تربیت ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریک کے زیرِ اثر ہوئی تھی۔ 1960ء سے قبل ابوالاعلیٰ مودودی سے جو نوجوان متاثر ہوئے، اُن میں سے بعض 1970ء کی دہائی میں ماہرین اقبالیات کے روپ میں سامنے آئے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر ابوسعید ابوالخیر، ڈاکٹر عبدالحق، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر شکیل الرحمان، ڈاکٹر وحید اختر، ڈاکٹر سید عابد حسین، ڈاکٹر محمد حسین، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، ڈاکٹر عبدالجبار شاکر، غرض کس کس کا نام لوں، 1990ء تک اقبالیات کے میدان میں جو نام نمایاں ہوئے ہیں، اُن میں اکثریت کا تعلق اسی ''دبستانِ مودودی'' سے تھا۔ ان لوگوں کی تحریروں میں وہی رنگ نمایاں ہے جو ابوالاعلیٰ مودودی کے ہاں پایا جاتا ہے۔ وہی مسئلہ قومیت، وہی مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، وہی اسلامی تہذیب اور اس کے اُصول ومبادی، وہی تجدید واحیاے دین کا تذکرہ، وہی اسلامی ریاست کے خدوخال اور وہی تفہیم القران کا ترجمہ، ہر کتاب میں پایا جاتا ہے۔

ماہرین اقبالیات کا تیسرا سلسلہ بالواسطہ یا بلاواسطہ امین احسن اصلاحی سے وابستہ ہے۔ ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری، ڈاکٹر ممتاز احمد، ڈاکٹر مستنصر میر، ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈاکٹر ظفر حسن ملک، پروفیسر محمد عثمان، ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی، ڈاکٹر وحید الرحمان، اسلامی نظریاتی کونسل کے موجودہ چیئر مین ڈاکٹر خالد مسعود، اقبال اکیڈمی کے موجودہ ڈائریکٹر محمد سہیل عمر اور بزم اقبال کے صدر مظفر مرزا اسی دبستان اصلاحی کے نمایاں نام ہیں۔ اس دبستان کے لوگ روشن خیالی اور جدیدیت کے پرزور حامی ہیں اور ساتھ ہی اقبال کے افکار کا محاکمہ کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

ماہرین اقبالیات میں دبستان آزاد، دبستان مودودی اور دبستانِ اصلاحی، تین نسلوں کے نام نہیں، بلکہ تین سلسلوں کے نام بھی ہیں۔ مستقبل میں یونیورسٹیوں میں اقبالیات کے میدان میں جو بھی کام ہوگا، وہ لامحالہ اُنھی خطوط پر ہوگا جو مندرجہ بالا تین سلسلوں کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ اُن کی درجہ بندی ہم یوں کر سکتے ہیں۔

## ماہرینِ اقبالیات (دبستانِ اقبال)

| دبستانِ آزاد | دبستانِ مودودی | دبستانِ اصلاحی |
|---|---|---|
| ادبی وتاریخی نوعیت کی تحقیقات | سیاسی وعمرانی نوعیت کی تحقیقات | تنقیدی اورتجدیدی نوعیت کی تحقیقات |

اقبال نے اپنے آپ کو صرف قیل وقال تک محدود نہیں رکھا تھا، بلکہ اُن کی پوری زندگی عملی میدان میں گزری تھی۔ سیاسی میدان میں مسلم لیگ کے ایک ادنیٰ کارکن کی حیثیت سے کام کیا۔ اُنھوں نے آل انڈیا مسلم لیگ میں (جو اُس زمانے میں وڈیروں اور نوابوں کے قبضہ میں تھی اور انگریز آقاؤں کی خوشامد کا فریضہ انجام دے رہی تھی) اسلام کا انجکشن لگایا۔ خطبہ الٰہ آباد میں ایک علیحدہ اسلامی ریاست کا تصور پیش کیا۔ گول میز کانفرنسوں میں مسلمانوں کی نمایندگی کی۔ نیز حکومت الہیہ کے قیام کے لیے ''جمعیت شبان المسلمین'' کے نام سے ایک جماعت قائم کرنے کی سرتوڑ کوشش کی۔ 1930ء کی دہائی کے اوائل سے ہی وہ اس جماعت کے قیام کی جدوجہد کر رہے تھے۔ ڈاکٹر سیّد ظفر الحسن، خواجہ عبدالوحید، ڈاکٹر برہان احمد فاروقی، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور مولانا غلام رسول مہر، اس پروگرام میں اقبال کے رفیقِ کار تھے۔ (واضح رہے کہ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور مولانا غلام رسول مہر ابوالکلام کی تحریک میں بھی رہ چکے تھے)۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے اپنی کتاب ''اقبال اور مسلمانوں کا سیاسی نصب العین'' میں تحریک شبانِ المسلمین کی روداد مفصل بیان کی ہے۔

پانچ چھ برسوں کی جدوجہد کے بعد جب وہ شبانِ المسلمین کے قائم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے تو اُنھوں نے ہندوستان کے دوسرے سرکردہ علما کو پنجاب منتقل ہونے کی دعوت دی تاکہ وہ یہ کام کر سکیں۔ اسی سلسلہ میں اُنھوں نے ابوالاعلیٰ مودودی کو دکن سے پنجاب منتقل ہونے کی دعوت دی جو اُنھوں نے کچھ پس وپیش کے بعد قبول کر لی۔ وہ پنجاب منتقل ہوئے اور جماعتِ اسلامی کے نام سے حکومتِ الہیہ کے قیام کی جدوجہد کرنے والی وہ صالح جماعت قائم کر لی جس کا خواب اقبال نے دیکھا تھا۔ اقبال اسلامی علوم کی تشکیلِ جدید کے زبردست حامی تھے۔ اس سلسلہ میں اُنھوں نے غلام احمد پرویز کو ایک ادارہ قائم کرنے کی طرف متوجہ کیا۔ پرویز صاحب نے اقبال ہی کی ایک نظم ''طلوعِ اسلام'' کے نام سے ''ادارہ طلوعِ اسلام'' قائم کر کے اقبال کے خواب کو عملی جامہ پہنایا۔

المختصر یہ کہ دبستانِ رومی میں علامہ اقبال (اور اُن سے وابستہ ماہرینِ اقبالیات) نے سب سے زیادہ ہمارے

اس عہد کو متاثر کیا حتیٰ کہ دبستانِ شبلی کے جملہ اکابر پیر رومی کے اسی مریدِ ہندی سے متاثر ہوئے۔ اقبال کے علاوہ دبستانِ رومی کے دوسرے اکابرین نے بھی مجموعی طور پر قابلِ قدر کام کیا ہے۔ خاص طور پر ڈاکٹر سید ظفر الحسن، ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم، ڈاکٹر میر ولی الدین، ڈاکٹر میاں محمد شریف، ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ڈاکٹر برہان احمد فاروقی، ڈاکٹر اسرار عالم، ڈاکٹر جاوید اقبال، ڈاکٹر احمد رفیق اختر اور ڈاکٹر وحید عشرت نے مسلم معاشرہ پر انتہائی دور س اثرات مرتب کیے۔ ان میں سے اکثریت تو درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے گوشۂ عافیت میں پناہ گزیں رہی، لیکن اُن میں سے بعض اقبال کی طرح عملی میدان کی طرف بھی متوجہ ہوئے۔

چنانچہ ڈاکٹر سید ظفر الحسن جو ذہنی طور پر فکرِ سر سید کے خوشہ چین تھے، انھوں نے آزادی ہند اور غلبہ اسلام کے لیے جماعت المجاہدین کے نام سے ایک جماعت قائم کی جس کا مقصد جہاد و قتال کے ذریعہ سے اولاً ہندوستان اور ثانیاً پورے عالمِ اسلام میں مسلمانوں کے گم شدہ ماضی کو بازیافت کرنا تھا۔ ڈاکٹر افضال حسین قادری، ڈاکٹر محمد محمود احمد اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی اس تحریک میں اُن کے اعوان و انصار تھے۔ علاوہ ازیں اُنھیں علامہ اقبال کی تائید و حمایت بھی حاصل تھی۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے اس جماعت کے اغراض و مقاصد، اس کی مختصر تاریخ اور اس سے اقبال کی غیر معمولی دلچسپی کی روداد اپنی کتاب ''اقبال اور مسلمانوں کا سیاسی نصب العین'' میں رقم کی ہے۔

ڈاکٹر سید ظفر الحسن نے اصلاح نفس، تنظیم، اتحاد اور جہاد و قتال کے ذریعے غلبہ اسلام کے لیے جس منفرد تحریک کا نقشہ 1920ء کے عشرے میں پیش کیا تھا۔ اس کی ایک تعبیر جماعت المجاہدین کی صورت میں سامنے آئی جو ان گنت وجوہات کی بنا پر زیادہ دیر تک اپنا وجود برقرار نہ رکھ سکی۔ لیکن اس خواب کی دوسری تعبیر عنایت اللہ خان المشرقی کی خاکسار تحریک کی صورت میں سامنے آئی جس نے اسلامیان ہند کے اذہان و قلوب میں زبردست ارتعاش پیدا کیا اور برصغیر کی سیاسی کشمکش میں ایک مؤثر کردار ادا کیا۔

ڈاکٹر سید ظفر الحسن کو تحریک پاکستان سے خصوصی دلچسپی تھی۔ قراردادِ پاکستان کی منظوری کے بعد مسلم لیگ کی راہنمائی کے لیے جو تھنک ٹینک تشکیل دیا گیا تھا، اُس کی سربراہی کا اعزاز بھی اُنھی کے حصہ میں آیا۔ دیگر مفکرین میں داکٹر افضال حسین قادری، ڈاکٹر محمد محمود احمد اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کے نام نمایاں ہیں۔ یہ تینوں حضرات ''جماعت المجاہدین'' کی مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن رہ چکے تھے۔

اقبال اور سید ظفر الحسن کے بعد عملی میدان کی طرف متوجہ ہونے والے تیسرے فلسفی ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم تھے۔ اُنھوں نے قیامِ پاکستان کے فوراً بعد لاہور میں ''ادارہ ثقافتِ اسلامیہ'' قائم کیا تا کہ نو آموز اسلامی ریاست کو تہذیبی

وثقافتی سطح پر جو چیلنج درپیش ہیں اُن کا مقابلہ کیا جا سکے۔ اُن کا مؤقف تھا کہ جدید زمانے کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ایک طرف مغرب کے گمراہ کن تہذیبی تصورات کا ردّ کیا جائے اور دوسری طرف اسلام کے علمی سرمایہ پر تنقیدی نظر ڈالی جائے اور زمانۂ حاضر کے تقاضوں کے مطابق اسلامی علوم کی تشکیل جدید کی جائے۔ پرویز صاحب کے جدت پسندوں کی طرف جھکاؤ کی وجہ سے اُن کا ادارہ اسلامی علوم کی تشکیل جدید کے حوالے سے کوئی مفید خدمت انجام دینے میں ناکام رہا، لیکن ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے قائم کردہ ادارے نے اس ضمن میں قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ جوہری طور پر ادارہ ثقافتِ اسلامیہ اور جاوید احمد غامدی کے قائم کردہ ادارے ''المورد'' کے مقاصد میں کوئی فرق نہیں۔ صرف یہ فرق ہے کہ مقدم الذکر ادارہ کے بانی کا تعلق دبستانِ رومی سے ہے اور مؤخر الذکر ادارہ کے بانی کا تعلق دبستانِ شبلی سے ہے۔ یا پھر سن کا فرق ہے کہ پہلا ادارہ 1948ء میں قائم ہوا تھا اور دوسرا اس کے تقریباً چالیس سال بعد قائم ہوا۔

عملی میدان میں اُترنے والے چوتھے فلسفی ڈاکٹر محمد رفیع الدین تھے۔ اُنھوں نے اولاً پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس کا مقصد سائنسی و عمرانی علوم کو اسلامی سانچے میں ڈھالنا تھا۔ ثانیاً اُنھوں نے 1960ء کی دہائی میں ایک جدید اسلامی یونیورسٹی کا تصور پیش کیا۔ اُن کا خیال تھا کہ روایتی دینی مدارس اس قابل نہیں رہے کہ دین کے میدان میں کوئی قابلِ قدر خدمات انجام دے سکیں۔ اِن مدارس سے فارغ التحصیل عام طور پر خانقاہی ذہنیت رکھنے والے مُلّا قسم کے لوگ ہوتے ہیں جو جدید ذہنوں کو مطمئن نہیں کر سکتے۔ لہٰذا ایک ایسی عظیم الشان اسلامی یونیورسٹی کی ضرورت ہے جو جدید زمانے کے تقاضوں کے مطابق روشن خیال علما مہیا کر سکے۔ بعد ازاں ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے بھی ایسی ہی ایک یونیورسٹی کا تصور پیش کیا تھا۔ اسلام آباد کی اسلامک انٹرنیشنل یونیورسٹی ڈاکٹر محمد رفیع الدین اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کے اِسی خواب کی تعبیر ہے۔ ثالثاً ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا خیال تھا کہ قرآن کی حکیمانہ تعبیر کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کے لئے اُنھوں نے 1960ء کی دہائی میں ''حکمتِ قرآن'' کے نام سے ایک جریدے کا اجرا کیا۔

ڈاکٹر اسرار احمد آپ سے بے حد متاثر تھے۔ اُنھوں نے اپنے فکری ماخذ کے طور پر جن آٹھ اشخاص کے نام بتائے ہیں، اُن میں ڈاکٹر محمد اقبال اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے نام نمایاں ہیں۔ 1967ء میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے جب اپنی ''تحریک رجوع الی القرآن'' کا آغاز فرمایا تو ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے اسی جریدے ''حکمتِ قرآن'' کو اس کا ترجمان بنالیا۔ اُس وقت سے آج تک یہ جریدہ تحریکِ رجوع الی القرآن کی ترجمانی کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔

پانچویں فلسفی جو عملی میدان میں اُترے، وہ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی تھے۔ چنانچہ جیسا کہ عرض کیا گیا وہ اپنی طالب علمی کے زمانے میں اقبال کی تحریک شبانِ المسلمین کے ایک سرگرم کارکن رہے۔ جماعت المجاہدین کی مرکزی مجلس شوریٰ کے ممبر رہے۔ تحریکِ پاکستان سے عملی دلچسپی رہی۔ 1944ء میں قائداعظم کے حکم پر تعلیمی کمیٹی کے لیے ایک سال کام کیا۔ اسی دوران اُنھوں نے ادب کی ترقی پسند تحریک کے مقابلہ میں اسلام پسند تحریک کی ضرورت کی طرف توجہ دلائی۔ اس خواب کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بعد میں کچھ لوگوں نے (جن میں سرِ فہرست نعیم صدیقی تھے) سرتوڑ کوشش کی اور بڑی حد تک وہ اس میں کامیاب بھی رہے۔ مزید برآں، ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی طرح ڈاکٹر برہان احمد فاروقی بھی روایتی دینی مدارس سے مایوس تھے اور ایک جدید اسلامی یونیورسٹی کے قیام کے زبردست حامی تھے۔ اس خواب کی عملی تعبیر، جیسا کہ اس سے پہلے بھی عرض کیا گیا، اسلامک انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد کی صورت میں سامنے آئی۔ نیز جماعتِ اسلامی کا منصورہ کالج، ڈاکٹر اِسرار احمد کا قائم کردہ قرآن کالج اور ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی قائم کردہ ''منہاج القران'' یونیورسٹی بھی اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے اپنی مشہور کتابوں ''منہاج القرآن''، ''قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل'' اور ''اقبال اور مسلمانوں کا سیاسی نصب العین'' میں ایک اسلامی، روحانی و عملی اور اصلاحی تحریک کا جو نقشہ پیش کیا تھا، اُس کو اُن کے شاگرد ڈاکٹر محمد طاہر القادری نے کچھ کمی بیشی کے بعد عملی جامہ پہنایا۔

ڈاکٹر وحید عشرت چھٹے فلسفی ہیں جنھوں نے عملی میدان کی آتش نمرود میں قدم رکھا۔ اُن کا خیال ہے کہ مغرب کے فلسفیانہ نظریات اسلام کو جو چیلنج دیتے ہیں اُن کا مسکت جواب دیے بغیر نہ اسلام کی عالمگیر اشاعت کے لیے راستہ ہموار ہوگا اور نہ اُمتِ مسلمہ قیادتِ اقوام کے منصب پر فائز ہو سکے گی۔ لہٰذا موجودہ زمانے کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ مغرب کے غلط فلسفیانہ نظریات نے علمی میدان میں جو گمراہیاں پیدا کر رکھی ہیں، اُن کا ردّ کیا جائے اور ان کے مقابلہ میں اسلام کے روحانی و اخلاقی، سیاسی و عمرانی، معاشی و معاشرتی اور تہذیبی و ثقافتی تصورات کی حقانیت واضح کی جائے۔ نیز عوام و خواص کو موجودہ زمانے کے گمراہ کن نظریات اور اُن کے مضمرات سے باخبر رکھنے کے لیے اس امر کی ضرورت ہے کہ چند نوجوان (بالخصوص وہ نوجوان جنھوں نے فلسفہ پڑھا ہو) کی اس نہج پر تربیت کی جائے کہ وہ ''لِيُحِقَّ الْحَقّ و يُبطِلَ الباطِلَ'' کا فریضہ انجام دے سکیں۔

اس مقصد کے لیے اُنھوں نے ''پاکستان اسلامک فلسفہ فورم'' تشکیل دیا۔ اس فورم میں فلسفہ کے طالب علموں کے علاوہ دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والے طالب علموں کی بھی ایک کثیر تعداد شامل ہے۔ ڈاکٹر وحید عشرت صاحب

اور اُن کے سینیئر رفقاء ان نو جوانوں کی تربیت کرتے ہیں۔ اُن کی اس محنت کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے ہیں اور نو جوان فلسفیوں کی ایک خاصی بڑی تعداد ایسی تیار ہوگئی ہے جو مستقبل میں اپنی زبان وقلم اور تحریر اور تقریر سے اسلام کا دفاع کریں گے اور اُس شاندار روایت کو آگے بڑھائیں گے جو ''دبستانِ رومی'' کا طرۂ امتیاز ہے۔

فلسفی مفکرین میں سے بعض نے نئے تصورات بھی پیش کیے۔ اس ضمن میں اقبال کا تصورِ خودی، خلیفہ عبدالحکیم کا نظریہ اتصال، محمد رفیع الدین کا فلسفہ نصب العین، برہان احمد فاروقی کا فلسفہ منہاجات اور ڈاکٹر احمد رفیق اختر کا فلسفۂ ترجیحات علمی حلقوں سے دادِ تحسین وصول کر چکے ہیں۔

مذہبی قدامت پسند اور لادین جدت پسند اب کشاں کشاں اپنے انجام کی طرف گامزن ہیں۔ اُن کی فکر اسلامی تاریخ کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ مقدم الذکر طبقہ مذہبی آمریت اور مسلمانوں پر خودکش حملوں کے ذریعہ، جبکہ موخر الذکر گروہ سیاسی آمریت اور عوام الناس پر بمباری کرنے کے ذریعے سے اپنی بقا کی کوشش کر رہا ہے، لیکن اُن کی فکر میں اتنی بے اعتدالی ہے کہ وہ اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ اسلامی تاریخ کی یہ دونوں غلطیاں اب تاریخ کے کوڑا دان کی نذر ہونے والی ہیں۔ مستقبل صرف اور صرف اعتدال پسندوں کے لیے مقدر ہے۔ اس حوالے سے جب میں مذکورہ اکابرین کی عظمت کا تصور قائم کرتا ہوں تو میری پروازِ تخیّل جواب دے جاتی ہے۔ دوسروں کو بھی میں یہ داستان سنانا چاہتا ہوں، لیکن اس کے سننے والے کم ہی ملتے ہیں۔ اکثر میں اپنے آپ سے ہمکلام ہو کر جی کا بوجھ ہلکا کر لیتا ہوں۔

دریں مے خانہ اے ساقی ندارم محرمے دیگر
کہ من شاید نخستیں آدمم از عالمے دیگر

محمد رفیع مفتی

# متفرق سوالات

[المورد میں خطوط اور ای میل کے ذریعے سے دینی موضوعات پر سوالات موصول ہوتے ہیں۔ المورد کے شعبۂ علم و تحقیق اور شعبۂ تعلیم و تربیت کے رفقا ان سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ ان میں سے منتخب سوال و جواب کو افادۂ عام کے لیے یہاں شائع کیا جا رہا ہے۔]

## میقات حرم اور ان کی تعداد

سوال: میقات سے کیا مراد ہے؟ یہ تعداد میں کتنے ہیں؟ نیز یہ بھی بتائیں کہ پاکستانی حجاج کرام اپنے احرام کس جگہ سے باندھتے ہیں؟ (ذوالفقار شافی)

جواب: حج و عمرہ کی غرض سے آنے والوں کے لیے حدود حرم سے کچھ فاصلے پر بعض جگہیں متعین کر دی گئی ہیں جن سے آگے وہ احرام کے بغیر نہیں جا سکتے۔ ان پر یا ان کے برابر کسی بھی جگہ پر پہنچ کر ضروری ہے کہ احرام باندھ لیا جائے۔ اصطلاح میں انھیں میقات کہا جاتا ہے۔ یہ جگہیں پانچ ہیں: مدینہ سے آنے والوں کے لیے ذوالحلیفہ، یمن سے آنے والوں کے لیے یلملم، مصر و شام سے آنے والوں کے لیے جحفہ، نجد سے آنے والوں کے لیے قرن اور مشرق کی طرف سے آنے والوں کے لیے ذات عرق۔

پاکستانی حجاج جب پاکستان سے سعودی عرب کی طرف روانہ ہوتے ہیں تو وہ میقات کے اوپر سے گزرتے ہوئے حدود حرم میں داخل ہو جاتے ہیں، ضروری ہے کہ وہ جب حدود حرم میں داخل ہوں تو احرام باندھے ہوئے ہوں، لہٰذا انھیں ابتدائے سفر یعنی کراچی ایئر پورٹ ہی سے احرام باندھنا پڑتا ہے۔ آج کل حج کرانے والی کمپنیاں

حاجیوں کی باقاعدہ رہنمائی کے لیے پورا پورا اہتمام کرتی ہیں، اس لیے آپ بے فکر رہیں، وہ اس مسئلے میں آپ کی پوری پوری رہنمائی کریں گی اور آپ کو ویسا ہی کرنا چاہیے جیسا وہ گائیڈ کریں۔

# استخارہ اور خیر کی طلب

سوال: استخارہ کرنے کی صورت میں جو جواب آئے، اس کی مخالفت کرنا درست ہے یا نہیں؟ (اعظم)

جواب: ایسا نہیں کہ دعاے استخارہ سے ہمارا خدا کے ساتھ رابطہ ہو جاتا ہے اور ہم اپنے مسئلے میں خدا کی بات یقینی صورت میں معلوم کر لیتے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر ظاہر ہے کہ اس کی مخالفت صریحاً غلطی ہوتی۔

دعاے استخارہ دراصل، خدا سے خیر طلب کرنے کی دعا ہے۔ یہ دعا درج ذیل ہے:

''اے اللہ، میں تیرے علم کے واسطے سے تجھ سے خیر طلب کرتا ہوں اور تیری قدرت کے واسطے سے قدرت طلب کرتا ہوں، اور تجھ سے تیرے فضل عظیم کا سوال کرتا ہوں، اس لیے کہ تو قدرت رکھتا ہے اور میں قدرت نہیں رکھتا، اور تو جانتا ہے، میں نہیں جانتا اور تو علام الغیوب ہے۔ اے اللہ، اگر تیرے علم میں یہ کام میرے دین اور میری زندگانی اور میرے انجام کار کے لحاظ سے بہتر ہے تو اسے میرے لیے مقدر کر دے اور آسان بنا دے، پھر اس میں برکت پیدا کر دے اور اگر تیرے علم میں یہ کام میرے دین اور میری زندگانی اور میرے انجام کار کے لحاظ سے برا ہے تو اس کو مجھ سے اور مجھے اس سے پھیر دے۔ (پروردگار)، میرے لیے خیر کو مقدر فرما، وہ جہاں کہیں بھی ہو، پھر مجھے اس سے راضی کر دے۔''

اس میں ہم اللہ سے اس کے علم کے مطابق جو چیز بہتر ہو، وہ طلب کرتے ہیں۔ جب یہ دعا قبول ہوتی ہے تو ایسا نہیں ہوتا کہ اشارے کے ذریعے سے خدا ہمیں اپنا کوئی فیصلہ سنا دیتا ہے، بلکہ دعا کی قبولیت کی صورت میں وہ اس چیز کو جو ہمارے لیے بہتر ہو، اسے ہمارے مقدر میں لکھ دیتا ہے، اس کے بارے میں ہمارا تردد ختم کر دیتا ہے، وہی ہماری پسند اور ہماری راے بن جاتی ہے، لہٰذا جو بات خواب وغیرہ میں ہم دیکھیں، اگر اس پر ہمارا دل نہیں جم رہا اور وہ ہمیں صحیح محسوس نہیں ہو رہی تو پھر اسے نہیں ماننا چاہیے۔ البتہ، اگر وہ ہمارے علم وعقل کے مطابق ہمیں بہتر محسوس ہو تب اس پر عمل کر لینا چاہیے، کیونکہ دعا کی قبولیت کی صورت میں خدا کے نزدیک جو بات بہتر ہے، اس نے مقدر ہو جانا ہے۔ خدا سے دعا مانگنے کے لیے دل کا اخلاص ضروری ہے۔ انسان کا پہلے سے بہت نیک ہونا لازم نہیں ہے۔

# زرعی بنک سے سود پر قرض

سوال: کیا ٹریکٹر خریدنے کے لیے زرعی بنک سے سود پر قرض لیا جا سکتا ہے؟ (جمال تارو)

جواب: سود لینے اور سود دینے میں فرق ہے۔ سود لینا حرام ہے، لیکن سود پر قرض لینا حرام نہیں ہے۔ چنانچہ غامدی صاحب کی رائے کے مطابق آپ ٹریکٹر خریدنے کے لیے زرعی بنک سے سود پر قرض لے سکتے ہیں۔

# غیر مسلم ریاست میں ملازمت

سوال: کیا کسی مسلمان کے لیے دین میں اس بات کی اجازت ہے کہ وہ کسی غیر مسلم ریاست میں اپنی ملازمت یا اپنے کاروبار کے لیے مستقل اقامت اختیار کرے؟ (فیاض احمد)

جواب: ہمارے نزدیک دینی اعتبار سے اس بات میں کوئی حرج نہیں ہے کہ آپ اپنی ملازمت یا اپنے کاروبار کے لیے کسی غیر مسلم ریاست میں مستقل طور پر قیام پذیر ہوں، سوائے اس کے کہ آپ کے لیے وہاں اپنے دین پر قائم رہنا ہی مشکل ہو جائے۔

غامدی صاحب نے اپنی کتاب ''میزان'' کے باب ''دین حق'' میں اسی مسئلے کو اس طرح سے بیان کیا ہے:

''بندۂ مومن کے لیے اگر کسی جگہ اپنے پروردگار کی عبادت پر قائم رہنا جان جوکھم کا کام بن جائے، اُسے دین کے لیے ستایا جائے، یہاں تک کہ اپنے اسلام کو ظاہر کرنا ہی اُس کے لیے ممکن نہ رہے تو اُس کا یہ ایمان اُس سے تقاضا کرتا ہے کہ اُس جگہ کو چھوڑ کر کسی ایسے مقام کی طرف منتقل ہو جائے جہاں وہ علانیہ اپنے دین پر عمل پیرا ہو سکے۔ قرآن اِسے ''ہجرت'' کہتا ہے۔ زمانۂ رسالت میں جب اللہ اور اُس کے رسول کی طرف سے براہ راست اِس کی دعوت دی گئی تو اِس سے گریز کرنے والوں کو قرآن نے جہنم کی وعید سنائی ہے۔

# زندگی کا مقصد اور بیعت

سوال: مجھے اپنے بارے میں ایسا لگتا ہے کہ میں غلط راستے پر چل رہا ہوں، مجھے اپنی زندگی کا کوئی مقصد سمجھ میں نہیں آتا، میں ایک اچھا انسان بننا چاہتا ہوں، لیکن میں کیسے بنوں؟ کسی کے لیے ایک اچھا انسان بننے کا کیا راستہ

ہے، کیا اس کے لیے کسی کی بیعت کرنی چاہیے؟ (شعیب اللہ)

جواب: اپنے بارے میں آپ کا یہ احساس بتاتا ہے کہ آپ کے اندر زندگی موجود ہے۔ داخل کی یہ زندگی خدا کا بڑا فضل ہوتی ہے۔ انسان اس دنیا میں ایک مسافر ہے۔ راہ، ہم سفر اور منزل، یہ تینوں چیزیں طے کرنے کے بعد ہی خدا نے انسان کو اس دنیا میں بھیجا ہے۔ ہماری راہ، صراط مستقیم ہے۔ چنانچہ فرمایا: 'اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ' ((اے اللہ) تو ہمیں سیدھی راہ پر چلا)۔

ہمارے ہم سفر خدا کے نبی اور صالحین ہیں۔ چنانچہ فرمایا: 'وَاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ' (اور تو مجھے نیک لوگوں سے جوڑ دے (دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی))۔ اور ہماری منزل خدا ہے۔ چنانچہ فرمایا: 'فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا' (پس جس کا جی چاہتا ہے، وہ اپنے رب کی طرف اپنا ٹھکانا بنا لے)، اور فرمایا: 'اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ' (بے شک، ہم اللہ کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں)۔

ہم اپنے اندر جیسی تبدیلی چاہتے ہیں، اسی کے مطابق ہمیں ماحول اپنانا چاہیے۔ میں آپ سے دو گزارشات کرنا چاہوں گا: ایک یہ کہ قرآن مجید کی تلاوت کرنا اور ترجمے کے ساتھ اسے پڑھنا اپنا شغل بنا لیجیے اور دوسرا صالحین کی صحبت کو لازماً اپنایئے۔ اپنے قریبی ماحول میں جو سمجھ دار نیک آدمی آپ کو نظر آئے، اس کے ساتھ اس کی نیکی کے پہلو سے متعلق ہو جایئے۔ اگر کسی استاد یا بزرگ کی صحبت میسر آ جائے تو اسے ضرور اپنایئے اور ان کی نصیحت کو دل کی آمادگی سے قبول کیجیے۔ ہمارے خیال میں اصل چیز صالحین سے تعلق ہے۔ روایتی بیعت وغیرہ کو باقاعدہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں۔

# شادی سے پہلے جنسی تعلقات

سوال: کیا شادی سے پہلے آدمی کا اپنی ہونے والی بیوی سے جنسی تعلق قائم کرنا ناقابل معافی جرم یعنی گناہ کبیرہ ہے۔ (جوناتھن سٹو)

جواب: شادی سے پہلے اپنی ہونے والی بیوی سے بھی جنسی تعلق قائم کرنا زنا ہی ہے اور بے شک یہ گناہ کبیرہ ہے۔ اس کے بارے میں قرآن مجید میں یہ فرمایا گیا ہے کہ:

''اور جو اللہ کے سوا کسی اور معبود کو نہیں پکارتے، اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو سوائے حق کے ہلاک نہیں کرتے اور

نہ زنا کے مرتکب ہوتے ہیں۔ جو کوئی یہ کام کرے گا، وہ اپنے گناہ کا بدلہ پائے گا، قیامت کے روز اُس کو مکرر عذاب دیا جائے گا اور اسی میں وہ ہمیشہ ذلت کے ساتھ پڑا رہے گا۔ سوائے اس کے کہ کوئی (ان گناہوں کے بعد) توبہ کر چکا ہو اور ایمان لا کر عمل صالح کرنے لگا ہو۔ ایسے لوگوں کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں سے بدل دے گا اور وہ بڑا غفور و رحیم ہے۔'' (الفرقان ۲۵: ۶۸-۷۰)

ان آیات سے پتا چلتا ہے کہ بے شک زنا گناہ کبیرہ ہے اور اس کی سزا جہنم کا ابدی عذاب ہو سکتی ہے، لیکن اگر اللہ چاہے تو یہ سچی توبہ اور اصلاح سے بالکل معاف بھی ہو سکتا ہے۔

## گناہ کبیرہ اور معافی

سوال: اگر کسی آدمی سے زنا ہو جائے تو آخرت میں اس جرم کی معافی کے لیے اسے دنیا میں کیا کرنا چاہیے؟ (جوناتھن سٹو)

جواب: آخرت میں اس کی معافی کے لیے یہ ضروری نہیں کہ دنیا میں آدمی لازماً سزا پا چکا ہو، بلکہ محض سچی توبہ اور اصلاح سے بھی یہ آخرت میں معاف ہو سکتا ہے۔

## سزا کا نفاذ

سوال: جرم کی سزا پانے کے لیے آدمی کس سے رابطہ کرے تاکہ وہ اس پر سزا نافذ کر دے؟

(جوناتھن سٹو)

جواب: اگر انسان کے کسی گناہ پر اللہ تعالیٰ پردہ ڈال دیتا ہے تو خود انسان کو بھی چاہیے کہ وہ اسے مشہور نہ کرے اور بس اللہ سے سچی توبہ کرے اور آیندہ کے لیے اپنی اصلاح کر لے۔ چنانچہ اسے نہ کسی شخص کے سامنے اپنے گناہ کا اقرار کرنے کی کوئی ضرورت ہے اور نہ اپنے اوپر لازماً سزا نافذ کرانے ہی کی کوئی ضرورت ہے۔

# کالے جادو کی شرعی حیثیت

سوال: کیا کسی مسلمان کو سفلی علوم (جادو ٹونے) کے ماہر سے اپنی بیماری یا مصیبت کا علاج کرانا چاہیے؟ (آصف حسین)

جواب: سفلی علوم (جادوٹونے) کے عاملوں سے لازماً بچنا چاہیے، کیونکہ یہ لوگ شیاطین کو خوش کرنے کے لیے کئی طرح کے مشرکانہ اور کافرانہ عمل کرتے ہیں۔ جو لوگ ان سے اپنا کوئی کام کراتے ہیں، وہ دراصل خدا کو چھوڑ کر ان کے شیاطین کی مدد سے اپنا کام کراتے ہیں۔ رہی ان لوگوں کی یہ بات کہ ہم تو اپنا عمل کرتے ہیں، شفا تو اللہ ہی دیتا ہے تو یہ بس ان کے منہ کی بات ہے جو شاید یہ مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لیے کہہ دیتے ہیں، ورنہ جادو کرنا کرانا تو صریح کفر ہے۔ ان کے اس قول کی مثال یہ ہے کہ کوئی چور بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ میں تو بس چوری کرتا ہوں، رزق تو مجھے اللہ ہی دیتا ہے۔ یقیناً چور اللہ کے اذن ہی سے چوری پر قادر ہوتا اور جادو کرنے والا اللہ کے اذن ہی سے جادو کر پاتا ہے اور اس کا جادو اللہ کے اذن ہی سے کامیاب ہوتا ہے، لیکن اللہ کی رضا اچھے کام کرنے میں ہے اور ناراضی برے کام کرنے میں ہے گو برے کام بھی اللہ کے اذن کے بغیر نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ آپ ان کے اس جملے سے دھوکا نہ کھائیں۔

# سورۂ نور کی آیت ۲۶ کا مفہوم

سوال: سورۂ نور کی آیت ۲۶ ''خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لیے اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لیے ہوں گے اور پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لیے ہوں گے'' اس آیت کے مطابق اس شخص کا کیا معاملہ ہوگا جس نے شادی سے پہلے کسی لڑکی سے محبت کی اور اس کے ساتھ جنسی عمل کے سوا اظہار محبت کے کئی طریقوں کو اختیار کیا۔ کیا ایسا شخص خبیث مردوں ہی کی صف میں آئے گا اور کیا اس کے مقدر میں خبیث عورت ہی ہوگی؟ (عبدالرحمٰن)

جواب: اس میں کوئی شک نہیں کہ جس خاتون سے انسان بہت محبت رکھتا ہو، اس کے ساتھ بہت مخلص ہو اور بڑے سچے جذبے سے اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہو، اس کو بھی کسی نسوانی اور جنسی پہلو سے دیکھتے رہنا، چھونا، اس

سے اسی نوعیت کی گفتگو کرنا اوراس کے ساتھ تنہائی میں بیٹھنا وغیرہ، یہ سب دینی اعتبار سے بالکل ناجائز ہے۔البتہ جس آیت کا آپ نے حوالہ دیا ہے، وہ آخرت سے متعلق ہے،اس کا دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہاں پر ہوسکتا ہے کسی کو اس کے کیے کی کوئی سزا دی جائے یا نہ دی جائے ،لہٰذا آپ جہاں شادی کرنا چاہتے ہیں، وہاں خواہ مخواہ کوئی شک نہ کریں۔اپنی معلومات کے مطابق تسلی رکھیں اور وہم میں نہ پڑیں۔

# استمنا بالید کی شرعی حیثیت

سوال: استمنا بالید (masturbation) کے جواز وعدم جواز کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ (اسفند یار یوسف)

جواب: یہ مکروہ عمل ہے اور تزکیہ اور پاکیزگی حاصل کرنے کی ذہنیت کے خلاف ہے۔اس سے بچنے ہی کی کوشش کرنی چاہیے۔البتہ، کسی خاص صورت حال میں اس شخص کے لیے یہ عمل جائز ہوگا جو کسی بڑے گناہ سے بچنے کے لیے اسے اختیار کرتا ہے۔شریعت میں چونکہ اس کی حرمت کا ذکر نہیں ہے، اس لیے ہم اسے حرام قرار نہیں دے سکتے۔

# حدود آرڈی نینس

سوال: غامدی صاحب کے نزدیک حدود آرڈی نینس کا نیا بل شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟ (عاقب خلیل خان)

جواب: غامدی صاحب اس بل سے متفق نہیں ہیں۔ان کے نزدیک اس بل میں شریعت کی رہنمائی سے شدید انحراف موجود ہے۔وہ اس بل میں موجود جن باتوں کو شریعت کی رہنمائی سے مختلف محسوس کرتے ہیں، ان میں چند درج ذیل ہیں:

۱۔اس بل میں مسلم اور غیر مسلم کی گواہی میں اور مرد وعورت کی گواہی میں فرق کیا گیا ہے،ان کے خیال میں یہ چیز شریعت سے ثابت نہیں ہے۔

۲۔اس بل کے مطابق زنا کی سزا سو کوڑے اور زنا بالجبر کی سزا موت ہے، جبکہ غامدی صاحب کے نزدیک جرم کی دو نوعیتیں ہیں: ایک اس کی سادہ شکل ہے، جیسے زنا یا چوری اور دوسری وہ شکل ہے جس میں مجرم قانون کے خلاف

قوت کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اس صورت میں زنا، زنا بالجبر کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور چوری، ڈاکے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک زنا بالجبر کی صورت میں مجرم کو دو سزائیں دی جائیں گی: ایک زنا کی سزا سو کوڑے اور دوسری حرابہ کی سزا جو سورۂ مائدہ کی آیت ۳۳-۳۴ کے تحت اسے دی جائے گی۔

۳۔ غامدی صاحب کے نزدیک زنا کا مقدمہ رجسٹر کرنے کے لیے چار گواہوں کی شرط لازم ہے، جبکہ اس بل کے مطابق دو گواہوں کے ملنے پر بھی مقدمہ رجسٹر کر لیا جائے گا۔ ایسے کچھ اور اختلافات بھی ہیں۔ مزید تفصیل کے لیے آپ غامدی صاحب کی کتاب ''میزان'' کے باب ''حدود و تعزیرات'' کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

## جائداد پر زکوٰۃ

سوال: میں اپنی جائداد پر واجب زکوٰۃ کیسے طے کروں۔ مزید براں کیا مجھے اپنے مکانوں پر زکوٰۃ دینا ہوگی اور میری بیوی کو اپنے مکان اور اپنے زیورات پر بھی زکوٰۃ دینا ہوگی؟ (افتخار صدیقی)

جواب: اگر میاں کی جائداد بھی ہے اور بیوی کی بھی تو دونوں کو اپنی اپنی جائداد پر زکوٰۃ دینا ہوگی۔

غامدی صاحب کے نقطۂ نظر کے مطابق اسلام نے ہم پر درج ذیل شرح سے زکوٰۃ عائد کی ہے:

''پیداوار، تجارت اور کاروبار کے ذرائع، ذاتی استعمال کی چیزوں اور حد نصاب سے کم سرمایے کے سوا کوئی چیز بھی زکوٰۃ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ یہ ہر مال، ہر قسم کے مواشی اور ہر نوعیت کی پیداوار پر عائد ہوگی اور ہر سال ریاست کے ہر مسلمان شہری سے لازماً وصول کی جائے گی۔

اس کی شرح یہ ہے:

مال میں ۲½ فی صدی سالانہ (اگر وہ مال ۶۴۲ گرام چاندی کی مالیت سے زیادہ ہے)۔

پیداوار میں اگر وہ اصلاً محنت یا اصلاً سرمایے سے وجود میں آئے تو ہر پیداوار کے موقع پر اُس کا ۱۰ فی صدی، اور اگر محنت اور سرمایہ، دونوں کے تعامل سے وجود میں آئے تو ۵ فی صدی، اور دونوں کے بغیر محض عطیۂ خداوندی کے طور پر حاصل ہو جائے تو ۲۰ فی صدی۔'' (میزان ۳۵۰)

اس اصول کے مطابق آپ کو ان مکانوں پر کوئی زکوٰۃ نہیں دینا جن میں آپ رہ رہے ہیں یا وہ آپ کے زیر استعمال ہیں۔ جو مکان کرایے پر اٹھے ہیں تو ان کے کرایے کا دس فی صد دینا ہوگا اور اگر وہ محض جائداد کی صورت میں

قیمت بڑھنے پر بیچنے کے لیے روکے ہوئے ہیں تو پھر ہر سال ان کی حاضر مالیت کا ڈھائی فی صد دینا ہوگا۔

زیورات پر مال کی زکوٰۃ (حاضر مالیت کا ڈھائی فی صد) لگے گی۔ اپنے کاروبار سے (جس میں آپ کا سرمایہ اور آپ کی محنت، دونوں صرف ہوتے ہیں اس سے) ہونے والی آمدنی اگر آپ کی حقیقی ضروریات کے بقدر رقم سے زیادہ ہے تو پھر کل آمدنی کا پانچ فی صد آپ کو دینا ہوگا۔

## یوسف علیہ السلام اور حکومت مصر

سوال: یوسف علیہ السلام اپنے زمانۂ حکومت میں کیا حکومت مصر کے ملازم تھے یا وہ ملک چلانے کے لیے پورے اختیارات رکھتے تھے؟ (عبدالحمید)

جواب: یوسف علیہ السلام کو مصر میں ملک چلانے کے پورے اختیارات حاصل تھے۔ اس کی دلیل درج ذیل آیات ہیں:

> ''اور بادشاہ نے کہا، اُس کو میرے پاس لاؤ، میں اُس کو اپنا معتمد خاص بناؤں گا۔ پھر جب اُس سے بات چیت کی تو کہا: اب تم ہمارے ہاں با اقتدار اور معتمد ہوئے۔ اس نے کہا: مجھے ملک کے ذرائع آمدنی پر مامور کیجیے، میں متدین بھی ہوں اور باخبر بھی۔ اور اِس طرح ہم نے یوسف کو ملک میں اقتدار بخشا، وہ اُس میں جہاں چاہے متمکن ہو۔'' (سورۂ یوسف ۱۲: ۵۴-۵۶)

ان آیات سے پتا چلتا ہے کہ وہ مصری حکومت کے ملازم نہیں، بلکہ مصر کے با اقتدار فرماں روا تھے۔

## غیر مسلم ممالک میں ملازمت

سوال: کیا کسی مسلمان کے لیے یہ بات جائز ہے کہ وہ کسی غیر مسلم حکومت کے تحت کام کرے۔ اگر کسی غیر مسلم حکومت کے تحت کام کرنا جائز ہے تو پھر اس کی حدود کیا ہیں اور اس میں کیا پابندیاں اختیار کرنا ہوں گی؟ (عبدالحمید)

جواب: مسلمان کے لیے غیر مسلم حکومت کے تحت کام کرنا بالکل جائز ہے۔ اس صورت میں ظاہر ہے، وہ دین و شریعت کے خلاف کوئی کام نہیں کرے گا یا ان کا کوئی ایسا حکم نہیں مانے گا جس سے خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی ہوتی ہو، لیکن اگر اس کے لیے غیر مسلم حکومت کے تحت بحیثیت مسلمان رہنا ممکن نہ رہے تو پھر اسے لازماً وہاں سے

نکل آنا چاہیے۔اس پہلو کو غامدی صاحب نے اپنی کتاب ''میزان'' کے باب ''دین حق'' میں اس طرح سے بیان فرمایا ہے:

''بندۂ مومن کے لیے اگر کسی جگہ اپنے پروردگار کی عبادت پر قائم رہنا جان جوکھم کا کام بن جائے، اُسے دین کے لیے ستایا جائے، یہاں تک کہ اپنے اسلام کو ظاہر کرنا ہی اُس کے لیے ممکن نہ رہے تو اُس کا یہ ایمان اُس سے تقاضا کرتا ہے کہ اُس جگہ کو چھوڑ کر کسی ایسے مقام کی طرف منتقل ہو جائے جہاں وہ علانیہ اپنے دین پر عمل پیرا ہو سکے۔قرآن اِسے ''ہجرت'' کہتا ہے۔زمانۂ رسالت میں جب اللہ اور اُس کے رسول کی طرف سے براہ راست اِس کی دعوت دی گئی تو اِس سے گریز کرنے والوں کو قرآن نے جہنم کی وعید سنائی ہے۔'' (میزان ۷۵)

# آسمانی کتابوں کا نزول

سوال: تورات الواح کی شکل میں نازل ہوئی تھی اور قرآن بتدریج نازل ہوا تھا۔سوال یہ ہے کہ انجیل کیسے نازل ہوئی تھی۔(منور حسین اصغر)

جواب: تورات کا کچھ حصہ الواح کی شکل میں نازل ہوا تھا، باقی تورات قرآن ہی کی طرح بتدریج نازل ہوئی تھی۔قرآن مجید میں تورات، انجیل اور خود قرآن تینوں کے لیے نازل کرنے کا لفظ بولا گیا ہے۔جیسا کہ فرمایا:

''اور وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اس پر جو نازل کیا گیا تیری طرف اور جو تجھ سے پہلے نازل کیا گیا۔'' (البقرہ ۲:۴)

''اس نے تم پر کتاب اتاری حق کے ساتھ، مصداق اس کی جو اُس کے آگے موجود ہے اور اُس نے تورات اور انجیل اتاری اس سے پہلے لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر اور پھر فرقان اتارا۔'' (آل عمران ۳:۳-۴)

یہ آسمانی کتب اصلاً فرشتوں کے ذریعے سے نازل کی گئی ہیں، جیسا کہ قرآن مجید کی سورۂ نحل میں ارشاد فرمایا:

''اپنے بندوں میں سے وہ جس پر چاہتا ہے، اپنے حکم کی وحی کے ساتھ فرشتے اتارتا ہے کہ لوگوں کو خبردار کرو کہ میرے سوا کوئی الٰہ نہیں، اِس لیے تم مجھی سے ڈرو۔'' (۱۶:۲)